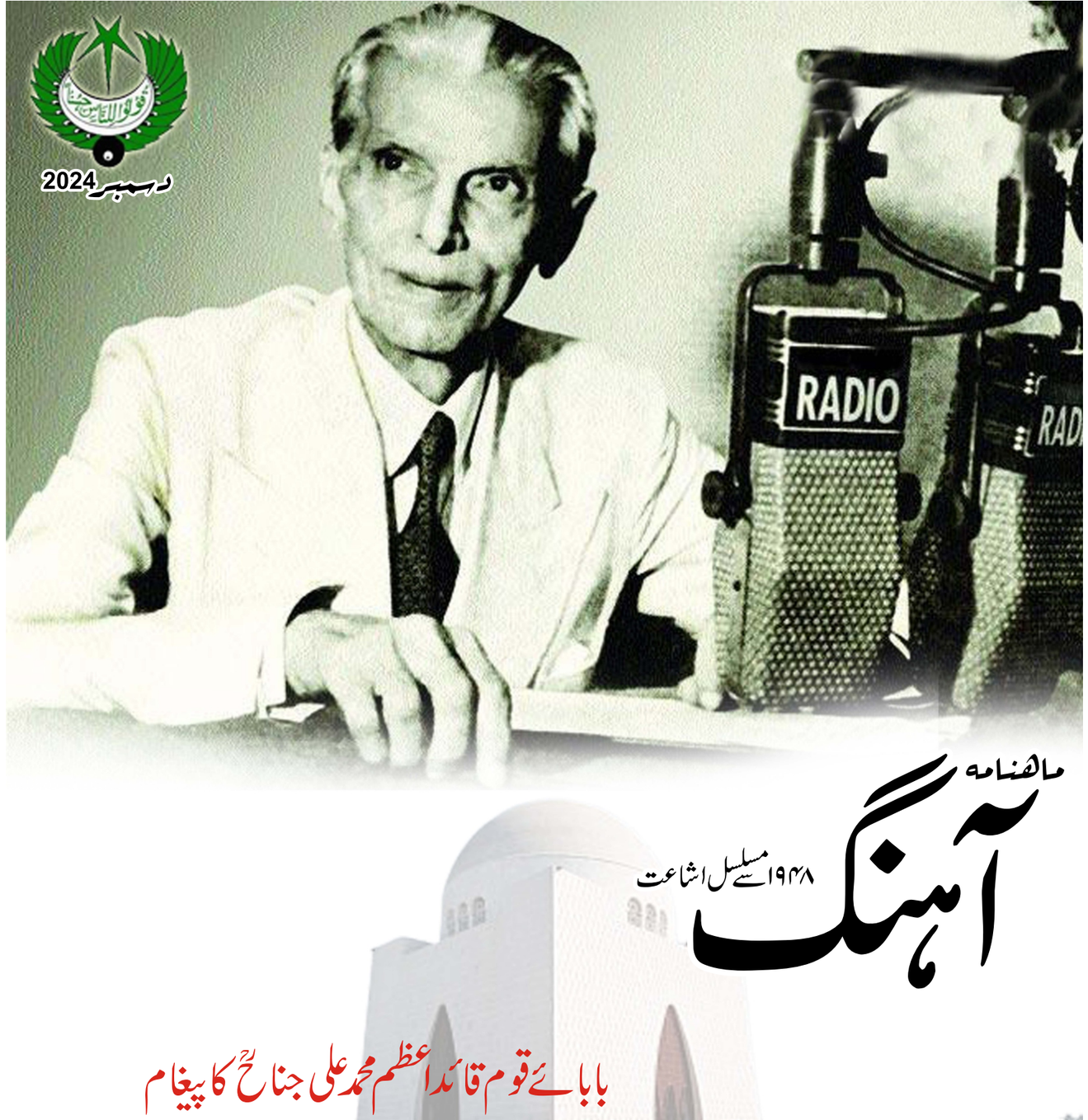

دسمبر 2024

ماہنامہ

آہنگ

۱۹۴۸ سے مسلسل اشاعت

بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناحؒ کا پیغام

’’میرا یہ پختہ ایمان ہے کہ ہماری نجات اُن سنہری اخلاقی ضوابط کی پیروی میں مضمر ہے جو ہمارے لئے ہمارے پیغمبرِ اسلام ﷺ نے متعین فرمائے ہیں۔ ہمیں جمہوریت کی بنیاد حقیقی معنوں میں اسلامی اندازِ فکر اور اصولوں پر رکھنی چاہئے۔ ہمارے خالقِ حقیقی نے ہمیں یہ سبق دیا ہے کہ مملکت کے امور کے بارے میں ہمارے فیصلے باہمی غور و فکر اور مشاورت سے طے پائیں‘‘۔

(14 فروری 1948ء کو سبی دربار بلوچستان سے خطاب)

اداریہ

قائداعظم ! تیری آمد تھی احسانِ خدا
تُو متاعِ ملک وملّت ،تُو سیاست کا امام

دسمبر کا مہینہ ہمیں بانی پاکستان محمد علی جناحؒ کے یومِ پیدائش کی یاد دلاتا ہے۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ ایک عظیم شخصیت، جن کی رہنمائی ،بلند حوصلے اور فولادی ارادوں کے طفیل ہمیں ایک آزاد شہری ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ قائداعظمؒ نے جیسے ہی سیاست میں قدم رکھا برصغیر کے مسلمانوں کے لیے حریّت اور آزادی کے لیے سالہا سال سے کوششیں کرتے رہے تاکہ برصغیر کے مسلمانوں کو غلامی سے نجات ملے۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ کے خون میں مسلمانوں سے محبت، اسلام کی بقاء، آپ ﷺ کے اسوہ حسنہ پر چلنے اور اللہ تعالی کے سامنے جواب دہی جیسے احساسات وتصورات اور جذبات شامل تھے، جس کا عکس اُن کی تقاریر اور فرمودات میں دکھائی دیتا ہے۔ 10 اکتوبر 1947ء کو بحیثیت گورنر جنرل پاکستان قائداعظمؒ نے اپنے خطاب میں فرمایا!

"اپنا فرض بجالاتے رہو اور خدا پر بھروسہ رکھو۔ دنیا کی کوئی طاقت پاکستان کو ختم نہیں کرسکتی۔ یہ قائم رہنے کے لیے بنا ہے۔ ہمارے اقدامات اور کارنامے دنیا پر ثابت کر رہے ہیں کہ ہم سچائی پر ہیں اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ دنیا کی ہمدردیاں بالخصوص اسلامی ممالک کی ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں۔ ہم اُس قوم کے ممنون ہیں جس نے امداد، تعاون اور دوستی کا ہاتھ ہماری طرف بڑھایا۔"

آج ہم ایک آزاد ملک اسلامی جمہور پاکستان کے آزاد شہری ہیں اور دعا ہے کہ اللہ تعالی ہمیں قائداعظم محمد علی جناحؒ کے فرمودات پر عمل کرنے کی توفیق دے۔

؎ تیری جرأت، تیری محنت، تیری سیرت، تیری ذات
ہیں ہمارے رہبر اب بھی تیرے ذریں اصول

وزیراعظم پاکستان جناب محمد شہباز شریف نے گزشتہ ماہ عرب سمٹ سے خطاب کرتے ہوئے فلسطین میں جنگ بندی کا مطالبہ کیا۔ اُنہوں نے کہا کہ اسرائیل کے خلاف جنگی جرائم کے تحت کاروائی پر زور دینا ہوگا اور فلسطین کو اُن کے حقوق دلانا ہوں گے۔

ہر سال 25 دسمبر کو پاکستان سمیت دنیا بھر کے مسیح کرسمس کا تہوار پورے جوش و جذبے سے مناتے آرہے ہیں۔ حکومتِ پاکستان قائداعظمؒ کے قائم کردہ اقلیتوں کے سارے حقوق فراہم کرنے میں آج بھی اُن کی خوشی میں ہمیشہ کی طرح برابر کے شریک ہے۔ اللہ پاک سے دُعا ہے کہ ہم سب ہر قسم کے تعصب سے بالاتر ہوکر ایک قوم کی طرح مل کر کام کریں۔ آمین

سرپرستِ اعلیٰ
عنبرین جان
نگرانِ اعلیٰ
سعید احمد شیخ
نگران
راحیلہ تسنیم
فخر عباس
مدیرِ اعلیٰ
افشاں نگار
مدیرہ
میمونہ شمیل
معاونت
امان اللہ سپرا
عاقل خان
محمد انعام الحق
کمپوزنگ
رابعہ شبیر احمد
قیمت -/500 روپے

فہرست دسمبر 2024

☆عزمِ نو۔۔۔۔
وزیراعظم جناب محمد شہباز شریف کا عرب سمٹ سے خطاب — 3
رپورٹ: چوہدری ضمیر اشرف
☆مضامین۔۔۔۔
بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ — تحریر و تحقیق: افشاں نگار — 4
خصوصی ریڈیو فیچر ''بھٹو کی بیٹی آئی تھی'' — محمد وقار عظیم — 6
☆قابلِ تقلید۔۔۔۔
حسین شہید سہروردی — ناصر علی خان — 7
☆علم و دانش۔۔۔۔
حفیظ جالندھری — آہنگ ڈیسک — 8
مولانا الطاف حسین حالؔی — پروفیسر عفت گل اعزاز — 9
☆تاریخ کے جھروکے سے۔۔۔۔
بغاوتِ زنگیان — محمد سعید احمد شیخ — 10
☆اُردو ادب۔۔۔۔
''انسان''، نظم (عالمی ادب جاپان) — ترجمہ: پیر علی محمد راشدی — 13
دسمبر کی ٹھٹھرتی شب (انشائیہ) — ڈاکٹر الطاف احمد شاہ — 14
سُخن ور۔۔۔۔
پطرس بخاری — سبین حیات — 17
منیر نیازی — مریم ارشد — 18
شیخ ایاز — حماد شاہ — 19
پروین شاکر — آمنہ عبیر — 20
☆افسانہ۔۔۔
کتبہ — غلام عباس — 21
☆صدائے عالم۔۔۔۔
دسمبر 2024 کو منائے جانے والے عالمی دن — 25
☆سیاحت۔۔۔۔
خوابیدہ بروغل — مدحت آصف — 27
☆ہم تو آواز ہیں۔۔۔۔
سلیم گیلانی — عظیم سرور — 28
کرسمس — رابعہ شبیر احمد — 30
سالگرہ ریڈیو پاکستان بھٹ شاہ — نثار گسی — 31
سالگرہ ریڈیو پاکستان لاہور — جاوید پاشا — 33
☆فن اور فنکار۔۔۔۔
موسیقار جی اے چشتی — آہنگ ڈیسک — 27
موسیقار رشید عطرے — 35
چھوٹے غلام علی خان
روشن آراء بیگم — 36
ملکۂ ترنم نور جہاں — 37
☆بیوٹی ٹپس۔۔۔۔
موسم سرما میں جلد کی حفاظت — 38
☆بچوں کا آہنگ۔۔۔۔
نیکی اپنا صلہ خود دیتی ہے — 39
☆آہنگ کا دسترخوان۔۔۔۔
چکن چاؤمن سُوپ — 40
دَم پُخت مچھلی

عالمی عدالت کے فلسطینیوں کی نسل کشی کیخلاف فیصلے پر عملدرآمد نہیں کیا جارہا:
وزیراعظم جناب محمد شہباز شریف کا عرب سمٹ سے خطاب

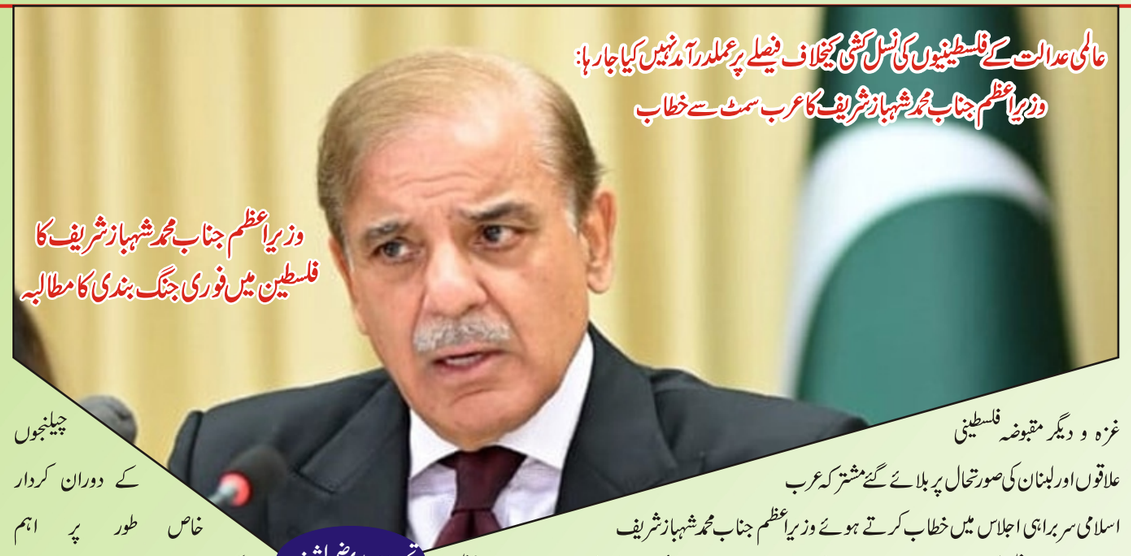

وزیراعظم جناب محمد شہباز شریف کا فلسطین میں فوری جنگ بندی کا مطالبہ

تحریر: چوہدری ضمیر اشرف

غزہ و دیگر مقبوضہ فلسطینی علاقوں اور لبنان کی صورتحال پر بلائے گئے مشترکہ عرب اسلامی سربراہی اجلاس میں خطاب کرتے ہوئے وزیراعظم جناب محمد شہباز شریف نے فوری طور پر فلسطین میں جنگ بندی کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا کہ اسرائیل خوراک کو بطور ہتھیار استعمال کر رہا ہے۔ سب سے پہلے فوری جنگ بندی کرانی ہوگی اور فلسطین میں امدادی سامان کی فراہمی کو یقینی بنانا ہوگا۔

سعودی عرب میں مشترکہ عرب اسلامک سربراہی اجلاس میں وزیراعظم جناب محمد شہباز شریف نے اپنے خطاب کا آغاز قرآن پاک کی آیت سے کیا اور کہا کہ فلسطین اور غزہ پر اسرائیلی قبضہ اور جارحیت جاری ہے۔ عالمی عدالت کے فلسطینیوں کی نسل کشی کیخلاف فیصلے پر عملدرآمد نہیں کیا جارہا۔ غزہ میں انسانی حقوق کی مسلسل خلاف ورزی کی جارہی ہے۔ اسرائیل کو خطرناک ہتھیاروں کی فراہمی مسلسل جاری ہے۔ غزہ سمیت فلسطین میں ہزاروں افراد کو شہید اور زخمی کیا جاچکا۔ وزیراعظم جناب محمد شہباز شریف کا کہنا تھا کہ لاکھوں افراد بے گھر ہو چکے۔ غزہ میں بھوک، افلاس کے ڈیرے ہیں۔ غزہ میں فوری جنگ بندی کی جائے۔ نہتے اور بیگناہ فلسطینیوں کا قتل بند کیا جائے۔ کانفرنس کو 4 بنیادی اقدامات پر عملدرآمد کرانا ہوگا۔ سب سے پہلے فوری جنگ بندی کرانی ہوگی۔ فلسطین میں امدادی سامان کی فراہمی کو یقینی بنانا ہوگا۔ اسرائیل کیخلاف جنگی جرائم کے تحت کارروائی پر زور دینا ہوگا۔ فلسطین کے عوام کو اُن کے حقوق دلانا ہوں گے۔ اسرائیل خوراک کی بندش کو بطور ہتھیار استعمال کر رہا ہے۔

وزیراعظم سے مسلم ورلڈ لیگ کے سیکرٹری جنرل کی ملاقات

وزیراعظم جناب محمد شہباز شریف سے ریاض میں مسلم ورلڈ لیگ کے سیکرٹری جنرل شیخ ڈاکٹر محمد بن عبدالکریم العیسی نے ملاقات کی۔ وزیراعظم نے مسلم ورلڈ لیگ کی جانب سے دنیا بھر میں اسلام کے حقیقی تشخص کے فروغ کے لئے کارہائے نمایاں کو سراہا۔ انہوں نے تنظیم کے کام کو آگے بڑھانے اور اتحادِ اُمت کے فروغ کے لئے سیکرٹری جنرل کی قیادت کو سراہا۔ وزیراعظم نے کہا کہ مسلم ورلڈ لیگ کا مسلمانوں کے مفادات و مقاصد کی وکالت، بھائی چارے، رواداری اور باہمی احترام کے پیغام کو عام کرنے میں اہم کردار ہے۔ انہوں نے مزید کہا مسلم ورلڈ لیگ کا غزہ میں جاری تنازعہ اور مسلم دنیا کو درپیش دیگر مختلف چیلنجوں کے دوران کردار خاص طور پر اہم ہے۔ وزیراعظم نے سیکرٹری جنرل کے حالیہ دورۂ پاکستان کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ مختلف منصوبوں اور اقدامات کی جلد تکمیل کے منتظر ہیں جن کی دونوں جانب سے منصوبہ بندی کی گئی ہے۔ انہوں نے پاکستان میں سیرت میوزیم کے قیام کا خاص طور پر ذکر کیا اور کہا کہ یہ عظیم الشان منصوبہ حضرت محمد ﷺ کی زندگی اور تعلیمات کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کرنے میں معاون ثابت ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ اِن منصوبوں کے ذریعے مسلم ورلڈ لیگ نوجوان نسل کی توجہ مبذول کر رہی ہے اور جدید ترین ڈیجیٹل ٹیکنالوجیز کے ذریعے اسلام کے لازوال پیغام کو پھیلا رہی ہے۔ وزیراعظم نے اُمید ظاہر کی کہ سیکرٹری جنرل کے آئندہ دورۂ پاکستان میں جاری منصوبوں کی رفتار اور تیزی سے عمل درآمد کو آگے بڑھایا جائے گا۔ مسلم ورلڈ لیگ کے سیکرٹری جنرل نے پاکستان اور مسلم اُمہ کے درمیان تعلقات کو مزید مضبوط بنانے کے لیے وزیراعظم پاکستان جناب محمد شہباز شریف کے عزم اور کوششوں کی تعریف کی اور سعودی عرب کے حالیہ کامیاب دوروں پر انہیں مبارکباد دی۔

نیوز اینڈ کرنٹ افیئرز چینل

تحریر و تحقیق: افشاں نگار

25 دسمبر قائداعظم محمد علی جناحؒ کی ولادت کا دن ہے۔ آپ کے کردار کی عظمت پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور زمانہ گواہ ہے کہ وہ ایک سچے، کھرے، بااصول اور باوقار انسان تھے۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ کی راست گوئی اور عظمتِ کردار سیرت ﷺ کے گہرے مطالعے کا اعجاز تھی۔ قائداعظمؒ کوئی روحانی بزرگ، صوفی یا مذہبی شخصیت نہیں تھے اور نہ ہی انہوں نے کبھی ایسا دعویٰ کیا۔ وہ اکثر لوگوں کے سوال کے جواب میں کہا کرتے تھے کہ ''میں مولانا نہیں صرف ایک عام مسلمان ہوں۔''

آپ نمود و نمائش، منافقت اور زندگی کے دوہرے معیار سے نفرت کرتے تھے۔ اُن کی تقاریر، اُن کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ اُن کے باطن اور دل کی گہرائیوں کے عکاس ہیں۔ محمد علی جناحؒ نے مارچ 1948ء میں چٹاگانگ کے جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ

''جب آپ کہتے ہیں کہ پاکستان کی بنیاد کسی اِزم کے بجائے سماجی انصاف اور اسلامی معاشرت پر ہونی چاہیے تو آپ نہ صرف میرے بلکہ لاکھوں مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ جب آپ ایک شخص کے لیے مساوی مواقع کی بات کرتے ہیں تو یہ بھی میرے خیالات کی عکاسی ہے۔ ترقی و خوشحالی کے اِس مقام کے بارے میں پاکستان میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اخوت، مساوات اور احترامِ آدمیت ہمارے مذہب، ہماری ثقافت اور ہماری تہذیب کے بنیادی اصول ہیں۔ ہم نے قیامِ پاکستان کے لیے بے پناہ جدوجہد صرف اِس لیے کی ہے کہ برِصغیر میں ہمارے یہ بنیادی حقوق محفوظ نہ تھے۔''

قائداعظم محمد علی جناحؒ کی تقاریر کی روشنی میں دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا اسلامی تشخص بہت گہرا تھا۔ وہ پاکستان کو اسلامی، جمہوری اور فلاحی ریاست بنانا چاہتے تھے۔ اللہ کا شکر ہے کہ آج ہم اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آزاد شہری ہیں۔

ملت ہوئی ہے زندہ پھر اُس کی پکار سے
تقدیر کی اذاں ہے محمد علی جناح

یہ قائداعظم محمد علی جناحؒ کی شخصیت کا ہی اعجاز تھا کہ علامہ اقبالؒ کے خواب کو تعبیر ملی۔ آپ خود اعتمادی اور مضبوط ارادے کے کوہِ گراں تھے۔ مخالفتوں کے طوفان، نکتہ چینی کی آندھیاں اور ناموافق حالات کے بھونچال بھی آپ کو اپنی جگہ سے ہلا نہ سکے۔

قائداعظم محمد علی جناحؒ نے ہمیشہ تلوار سے نہیں بلکہ قلم سے کام لیا، خون برساتی شمشیر سے نہیں بلکہ زبان کی تاثیر سے کام لیا۔ آپ نے ہمیشہ اپنے نوجوانوں کو سیاست سے دور اور علم کی روشنی سے منور رہنے کا حکم دیا۔

آپ کا اصل نام محمد علی جناح تھا۔ قائداعظم قومی خطاب تھا جو 1938ء سے اُن کے اصل نام سے بھی زیادہ مشہور ہوگیا تھا۔ پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی نے اپنے پہلے اجلاس میں اتفاقِ رائے سے اِس عوامی خطاب کو سرکاری طور پر منظور کرلیا۔ 25 دسمبر 1876ء کو بروز اتوار کراچی میں کھارادر کی بستی میں وزیر منشن میں پیدا ہوئے۔ اصل وطن راج کوٹ کاٹھیاوار تھا۔ اُن کے والد جناح پونجا چمڑے اور کھالوں کا کاروبار کرتے تھے اور چند برس پہلے ہی کاروبار میں توسیع کے لیے راجکوٹ سے کراچی منتقل ہوئے تھے اور کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ محمد علی اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ احمد علی اور بندے علی غیر معروف رہے۔ فاطمہ جناح زندگی بھر اُن کے ساتھ رہیں۔ مریم اور شیریں غیر معروف رہیں۔

آپ نے 1885ء اور 1886ء میں گوکل داس تیج پرائمری سکول بمبئی میں پھر سندھ مدرسۃ الاسلام اور کرسچن مشن ہائی سکول کراچی میں تعلیم پائی۔ 16 برس کی عمر میں 1892ء میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلستان گئے۔ وہاں لنکزان سے 1896ء میں بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔

قائداعظم کی شخصیت پر پہلا سیاسی اثر دادا بھائی نوروجی کا ہوا جو انگلستان میں اُس وقت

پارلیمانی انتخابات میں آزاد امیدوار کی حیثیت سے حصہ لے رہے تھے۔ جب آپ لندن میں تعلیم پا رہے تھے دادا بھائی کی انتخابی مہم میں آپ نے سرگرمی سے حصہ لیا۔ بعد میں دادا بھائی کے پرائیویٹ سیکرٹری بن گئے۔ آپ نے سرندرناتھ بینرجی، گوکھلے اور سر فیروز شاہ مہتہ سے بھی اثر لیا۔ گوکھلے کے آپ زیادہ قریب تھے اور کہا کرتے تھے کہ میں ''مسلم گوکھلے'' بننا چاہتا ہوں۔

قائداعظم کی سیاسی زندگی کا آغاز 1906ء میں ہوا۔ اس سال وہ نیشنل کانگرس کے صدر دادا بھائی نوروجی کے سیکرٹری کی حیثیت سے کانگرس کی سالانہ اجلاس منعقدہ کلکتہ میں شریک ہوئے۔ انہوں نے اُسی اجلاس میں نہ صرف یہ کہ کانگرس کی رکنیت اختیار کی بلکہ وقف علی الاولاد کے سلسلے میں اپنی پہلی سیاسی تقریر میں باقاعدگی سے شریک ہوتے رہے۔ خود بھی قراردادیں پیش کرتے رہے اور دوسرے رہنماؤں کی پیش کردہ قراردادوں پر اپنی رائے کا برملا اور شائستہ لہجے میں اظہار کرتے رہے

۔اپریل 1913ء میں دوبارہ انگلستان گئے۔ وہاں گوکھلے سے طویل رفاقت رہی۔ ہندوستان نے طلباء کو ایک پلیٹ فارم مہیا کرنے کے لیے لندن انڈین ایسوسی ایشن قائم کی۔ اُس زمانے میں مولانا محمد علی جوہر اور سید وزیر حسن کی فرمائش پر آل انڈیا مسلم لیگ میں شمولیت اِس شرط پر اختیار کی کہ مسلم لیگ میں اُن کی رکنیت اُن کی کانگرس کی رکنیت پر کسی بھی اعتبار سے اثرانداز یا خلل انداز نہیں ہوگی۔

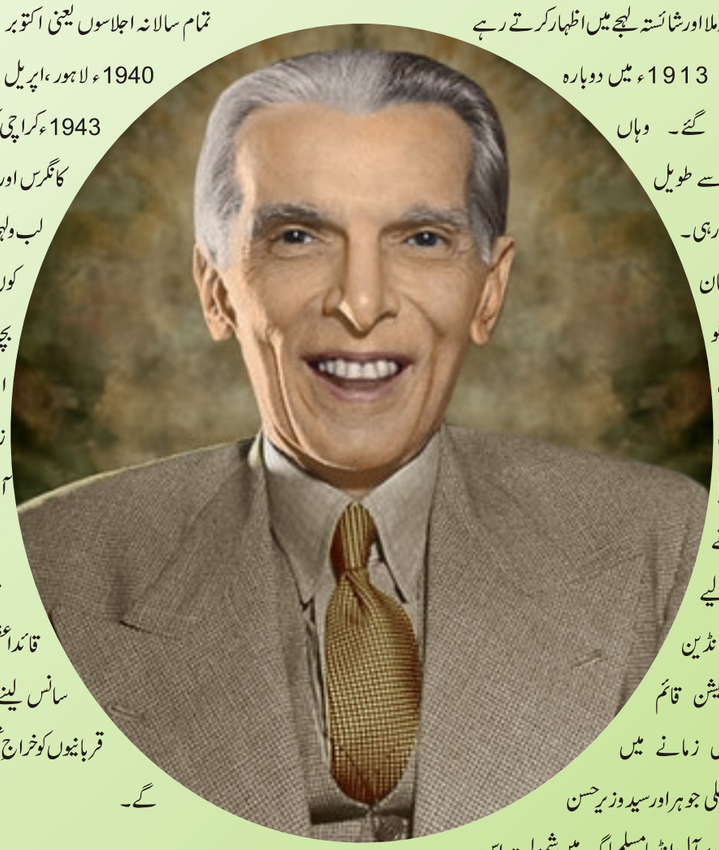

1920ء میں 14 سالہ رفاقت کے بعد کانگرس کی رکنیت سے مستعفی ہوگئے۔ جب ہوم رول لیگ کا نام تبدیل کر کے ''سوراجیہ سبھا'' رکھ دیا گیا تو اُس کی رکنیت سے بھی استعفیٰ دے دیا۔ اب اگرچہ وہ کانگرس کے رکن نہیں رہے تھے لیکن قومی مفادات کی خاطر ہمیشہ اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے رہے۔ 1924ء میں ممبئ آل انڈیا مسلم لیگ کے 15ویں سالانہ اجلاس لاہور کی صدارت کی۔ آپ کو اِس اجلاس میں آئندہ تین سال کے لیے مسلم لیگ کا صدر منتخب کیا گیا۔ 1928ء میں جنوری آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ کلکتہ میں سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا۔ مزید تین سال کے لیے مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے۔ نہرو رپورٹ کو ناکام اور مایوس کن قرار دیا۔ 1929ء میں آپ نے اپنے مشہور 14 نکات پیش کیے۔ 1937 کے انتخابات میں سات صوبوں میں کانگرس نے بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کی جس کے نشے میں پنڈت جواہر لال نہرو اور دوسرے لیڈروں نے مسلم لیگ کی تعاون کی پیشکش کو مسترد کر دیا اور مخلوط وزارت بنانے کی تجویز کو ٹھکرا دیا۔ انتخابات میں شکست کے نتیجے میں قائداعظم نے مسلم لیگ کی تنظیم کے تمام سالانہ اجلاسوں یعنی اکتوبر 1937ء میں لکھنو، اپریل 1938ء کلکتہ، مارچ 1940ء لاہور، اپریل 1941ء مدراس، اپریل 1943ء دہلی اور دسمبر 1943ء کراچی کی صدارت قائداعظمؒ نے کی اور ہر خطبہ صدارت میں کانگرس اور گاندھی جی کے عزائم کے بارے میں آپ کا رویہ اور لب و لہجہ سخت سے سخت تر ہوتا گیا۔

کون جانتا تھا کہ 25 دسمبر کو کراچی میں پیدا ہونے والا بچہ جبر و استبداد، غلامی، لاچاری اور بے بسی میں مبتلا انسانوں کے لیے صورِ اسرافیل کا کام دے گا۔ غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے لوگوں میں اتنی ہمت و قوت آجائے گی کہ وہ تنکوں سے اپنے گھونسلے تعمیر کریں گے۔

بالیدہ ہے زمین، وطن کی نمو میں وہ
مضطر ہے مثلِ شعلہ، ہمارے لہو میں وہ

قائداعظم محمد علی جناحؒ کی پیدائش کے موقع پر آزاد مملکت میں سانس لینے والے ہم آزاد شہری آج بھی بابائے قوم کی لازوال قربانیوں کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں اور تادمِ مرگ پیش کرتے رہیں گے۔

خصوصی ریڈیو فیچر

''بھٹو کی بیٹی آئی تھی''

محترمہ بینظیر بھٹو شہید کی فیچر میں نشر کردہ تقاریر سے اقتباسات

قارئین کی نذر

محمد وقار عظیم

1986ء کے جلسے میں بے نظیر بھٹو نے واضح کیا کہ اُن کی سیاست کا مقصد عوام کی خدمت اور جمہوریت کی بحالی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ:

''ہمیں اپنے ماضی کی غلطیوں سے سیکھنا ہوگا۔ یہ وقت ذاتی اختلافات کا نہیں بلکہ قومی وحدت کا ہے۔ آج ہم مل کر وہ پاکستان بنائیں گے جس کا خواب قائداعظمؒ نے دیکھا اور جس کے لیے میرے والد نے اپنی جان قربان کی۔"

بے نظیر بھٹو کی پہلی حلف برداری کی تقریر ایک تاریخی لمحہ تھی جس میں اُنہوں نے پاکستان کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے، جمہوریت کو مضبوط کرنے اور عوام کی فلاح و بہبود کے لیے اپنے عزائم کا اظہار کیا۔ 2 دسمبر 1988ء کو وزیراعظم کے طور پر اپنے عہدے کا حلف اُٹھانے کے بعد کی گئی اُن کی تقریر میں اُنہوں نے عوام کے خوابوں کی تعبیر کا عزم کرتے ہوئے کہا:

''آج پاکستان میں جمہوریت کی فتح ہوئی ہے۔ یہ میری نہیں، عوام کی جیت ہے۔ ہم نے ایک طویل اور کٹھن سفر طے کیا ہے تاکہ آمریت کا خاتمہ کر کے عوام کی آواز کو پارلیمنٹ میں پہنچا سکیں۔"

اُسی تقریر میں خواتین اور نوجوانوں کے لیے اُنہوں نے فرمایا:

''میں پاکستان کی خواتین کے لیے ایک نئی صبح کا آغاز دیکھ رہی ہوں۔ ہم اُن کے حقوق کے تحفظ، تعلیم کے مواقع اور روزگار کے لیے مساوی مواقع فراہم کرنے کے لیے کام کریں گے''۔

اُنہوں نے معاشرتی مساوات اور ترقی کا عزم کرتے ہوئے مزید کہا:

''ہم اِس بات کو یقینی بنائیں گے کہ پاکستان کا ہر فرد اپنی صلاحیتوں کے مطابق زندگی گزار سکے۔ ہماری ترجیحات میں غربت کا خاتمہ، تعلیم کی فراہمی اور صحت کے شعبے میں بہتری شامل ہے۔''

تقریر کے عزم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بے نظیر بھٹو نے اپنے پہلے دورِ حکومت میں خواتین کے لیے متعدد اقدامات کیے۔

ان اقدامات کے تحت لیڈی ہیلتھ ورکرز پروگرام کا آغاز ہوا جو پاکستان کے دیہی علاقوں میں صحت کی بنیادی سہولیات کی فراہمی کے لیے شروع کیا گیا جس نے ہزاروں خواتین کو ملازمت کے مواقع فراہم کیے اور دیہی علاقوں میں صحت کی سہولتیں بہتر کیں۔

خواتین کی معاشی خودمختاری کے لیے اُنہوں نے ویمن بینک قائم کیا جہاں خواتین کو آسان قرضوں اور بینکنگ سہولیات تک رسائی دی گئی۔

اُن کے دور میں خواتین کے تحفظ اور اُن کے حقوق کے لیے قانون سازی کی گئی جن میں جائیداد کے حقوق، گھریلو تشدد سے تحفظ اور کام کی جگہ پر مساوات کے لیے قوانین شامل تھے۔

بے نظیر بھٹو کی حلف برداری کی تقریر اور اُن کے عملی اقدامات نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا بھر میں ایک علامت بن گئے۔ اُن کے الفاظ اور پالیسیاں آج بھی خواتین کے حقوق اور سماجی مساوات کی تحریکوں کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔

محترمہ بے نظیر بھٹو شہید کی سترہویں (17ویں) برسی کے موقع پر یہ خصوصی ریڈیو فیچر 27 دسمبر 2024ء کو اسلام آباد اسٹیشن سے نشر کیا جائے گا۔

☆☆☆

حسین شہید سہروردی

ناصر علی خان

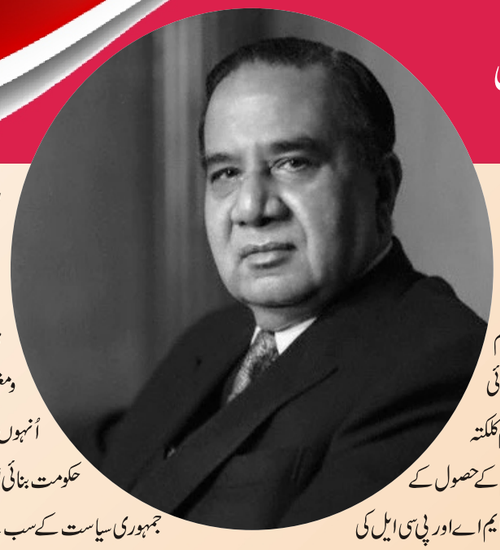

حسین شہید سہروردی تحریک پاکستان کے رہنما۔ آٹھ دسمبر 1893ء کو مدنپور مغربی بنگال میں پیدا ہوئے۔ اُن کے دادا ڈھاکہ کے ایک عربی مدرسے کے سرپرستِ اعلیٰ تھے۔ والد سر زہد الرحیم زاہد سہروردی عربی اور فارسی کے اسکالر اور کلکتہ ہائی کورٹ کے جج تھے۔ حسین شہید نے ابتدائی تعلیم کلکتہ کے گیسٹ ریوریز کالج سے حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے انگلستان چلے گئے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی سے ایم اے اور پی سی ایل کی ڈگریاں حاصل کیں۔ وطن واپس آکر کلکتہ میں وکالت شروع کی۔ ساتھ ہی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ تحریکِ خلافت سے وابستہ رہے۔ کلکتہ میونسپل کارپوریشن کے ڈپٹی میئر منتخب ہوئے۔ بنگال میں مسلم لیگ کے سیکرٹری کی حیثیت سے تنظیم نو کے سلسلے میں دن رات کام کیا۔ صوبائی اسمبلی کا رکن منتخب ہونے کے بعد مسلم لیگی کابینہ میں وزیر مقرر ہوئے۔ 1943 تا 1945ء وزیر خوراک رہے۔ 1946ء کے انتخابات میں کامیاب ہو کر بنگال کے وزیر اعلیٰ بنے۔ اُن کی کابینہ میں محمد علی بوگرا بھی شامل تھے جن کو بعد میں ملک غلام محمد گورنر جنرل نے وزیر اعظم نامزد کیا تھا۔ نورالامین اُس وقت بنگال اسمبلی کے سپیکر تھے۔ 16 اگست 1946ء کو جب مسلم لیگ نے یومِ راست اقدام بنایا تو ہندوؤں نے کلکتہ میں مسلمانوں کی خون سے ہولی کھیلی۔ اُس وقت جناب سہروردی وزیر اعلیٰ تھے۔ اُنہوں نے اپنے تدبر سے فسادات کی آگ کو زیادہ نہیں بھڑکنے دیا۔

1946ء میں پورے ہندوستان کے مسلم لیگ کے منتخب اُمیدواروں کا ایک کنونشن دہلی میں منعقد ہوا جس میں آپ نے ''قراردادِ لاہور'' میں ایک ترمیم منظور کرائی جس کی رو سے مسلمانانِ ہند دو مملکتیں نہیں بلکہ ایک مملکت کا مطالبہ کرتی ہیں۔ یہ ''قراردادِ دہلی'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ قیامِ پاکستان کے وقت ہندو مسلم فسادات کے پیشِ نظر اُنہوں نے کمال جرأت سے کام لے کر گاندھی جی کی معیت میں صوبے کا دورہ کیا اور اس طرح فسادیوں کی سازش کو ناکام بنایا۔ 1950ء میں پاکستان آگئے۔ یہاں آکر حزبِ اختلاف کی جمہوری روایت کی بنیاد ڈالی۔ پاکستان کے سیاسی اُفق پر اُن کا نام صفِ اوّل کے رہنماؤں میں شامل رہا۔ 1954ء میں وزیرِ قانون اور 1955ء میں وزیر اعظم منتخب ہوئے۔ 1956ء کے آئین کی تیاری میں اور مشرقی و مغربی پاکستان میں مساوات کا اصول منوانے میں اُنہوں نے اہم کردار ادا کیا۔ آئی آئی چندریگر نے نئی حکومت بنائی تو حزبِ اختلاف کے سربراہ رہے۔ وہ ملک میں جمہوری سیاست کے سب سے بڑے علمبردار، حق گو اور بے لوث سیاستدان تھے۔ اُن کے بڑے بھائی حسن شاہد سہروردی کئی زبانوں کے ماہر تھے۔ اسپین، مراکش اور تیونس میں پاکستان کے سفیر رہے۔ پبلک سروس کمیشن کے چیئرمین بھی رہے۔ وہ تین مارچ 1965ء کو فوت ہوئے۔

پاک چین تعلقات کے معمار بھی حسین شہید سہروردی ہی تھے۔ انہوں نے مغربی بلاک کے دباؤ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے 1956ء میں چین کا دورہ کیا اور وزیر اعظم قرار پاتے ہی چین کے ساتھ تعلقات قائم کیے۔ اِس دورے میں کابینہ اور اعلیٰ افسران کا ایک بڑا وفد بھی حسین شہید سہروردی کے ساتھ تھا جس نے اُس وقت کے چینی وزیر اعظم چواین لائی کے ساتھ ملاقات کی اور الائنس پیکٹ پر دستخط کیے۔ اِس ملاقات کے بعد ہی بیجنگ میں پاکستانی سفارت خانہ قائم کیا گیا۔ آپ کا شمار اِس خطہ کے اُن مسلمان رہنماؤں میں ہوتا ہے جنہوں نے مسلم تشخص کو اُجاگر کرنے، مسلمانوں کے سیاسی و اقتصادی حقوق کے تحفظ، برطانوی سامراج سے آزادی اور مسلمانوں کے لیے ایک الگ مملکت کے حصول کے لیے بے پناہ خدمات سرانجام دیں۔ آپ ایک نڈر اور بے باک سیاستدان کی حیثیت سے مشہور تھے۔

پانچ دسمبر 1963ء کو حرکتِ قلب بند ہو جانے کے سبب لبنان کے شہر بیروت میں انتقال کر گئے۔

قومی پرچم کے خالق
ابوالاثر حفیظ جالندھری

پاک سرزمین شاد باد　　کشورِ حسین شاد باد
تُو نشانِ عزمِ عالیشان　　ارضِ پاکستان!
مرکزِ یقین شاد باد

قومی نغمے کے ابتدائی بول جس کی دُھن اور بول تیار کرنے کا کام پاکستان بننے کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا، پاکستان کا یہ قومی ترانہ سرکاری طور پر 1945ء میں پاکستان کا قومی ترانہ قرار پایا۔ اس کے بول حفیظ جالندھری نے 1952ء میں تخلیق کیے اور اِس کی دُھن بنانے کا شرف احمد غلام علی چھاگلہ کو 1949ء میں حاصل ہوا۔

اُردو کے قومی ادب میں حفیظ جالندھری کی گراں قدر خدمات ہیں۔ حفیظ جالندھری نہ صرف شاعر بلکہ ایک اچھے ادیب، نثر نگار اور نظم لکھنے میں خاص ملکہ رکھتے تھے۔ معاشرے کی حساس نبض پر اُن کا ہاتھ تھا۔ وہ سننے اور پڑھنے والوں کے دل کی آواز، احساسات اور جذبات کو محسوس کرتے اور پھر اپنے قلم کا جادو جگاتے۔ اُن کی ایک نظم ''رقاصہ'' جو نوجوانوں میں ایک عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی خوب مقبول رہی اور نوجوان طبقہ اکثر اُن سے یہ نظم سننے کی فرمائش کرتا۔ اُن کی مشہور نظم ''ابھی تو میں جوان ہوں'' جسے ملکہ پکھراج نے گایا اور اس کلام کی وجہ سے خوب شہرت حاصل کی۔

حفیظ جالندھری نے نہ صرف غزلوں اور نظموں میں اپنی شاعری کا جادو جگایا بلکہ اُن کی شاعری کا دلکش حُسن ہمیں اُن کے لکھے گیتوں میں بھی نظر آتا ہے۔ حفیظ جالندھری رومانی شاعر ہونے کے علاوہ ایک افسانہ نگار بھی تھے۔ آپ نے نا صرف اُردو زبان بلکہ ہندی اور رومن میں بھی شاعری کی اور اپنا لوہا منوایا۔

حفیظ کی غزلوں کا سرمایہ کافی ہے اور حفیظ خود کو غزل گو کہلوانا پسند کرتے تھے۔ اُنہوں نے غزل میں بہت سے نئے تجربات کیے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سلیس زبان کا استعمال کیا اور گردوپیش کے واقعات کو اپنی غزلوں کا موضوع بنایا۔ ایک طرح سے اُنہوں نے غزل کو فطری پوشاک عطا کی۔ اُن کے یہاں روایت سے بغاوت ملتی ہے۔

حفیظ علامہ اقبال سے بہت متاثر تھے۔ اکثر اقبال کے ہاں حاضری دیتے۔ علامہ اقبال نے جب 1926ء میں پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لیا تو آپ کی انتخابی مہم میں حفیظ اکثر آپ کے ساتھ رہتے۔ حفیظ نے اپنے مضمون ''حفیظ کا اقبال'' میں جہاں علامہ اقبال سے اُن کی بے تکلفی کا ذکر کیا ہے وہاں وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ''ایک روز اقبال نے علی بخش کو جالندھر بھیج کر مجھے لاہور طلب کیا اور کہا کہ حفیظ! تم میرا مرثیہ لکھنا''۔ حفیظ تحریر کرتے ہیں کہ اقبال نے اُن سے شاہنامہ میں سے ولادتِ رسول کے اشعار سنانے کی درخواست کی جسے انھوں نے قبول کیا۔

حفیظ جالندھری 14 جنوری 1900ء کو جالندھر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم جالندھر ہی سے حاصل کی۔ قادر الکلام فارسی شاعر مولانا غلام قادر بلگرامی کے شاگرد تھے۔ جنگِ عظیم دوم کے زمانے میں فوج میں پبلسٹی آفیسر مقرر ہوئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد افواجِ پاکستان میں ڈائریکٹر جنرل آف مورالز اور امورِ کشمیر منعقد ہوئے شاعر کی حیثیت سے نظم اور غزل دونوں پر قادر تھے۔ خصوصاً اُردو میں گیت کی طرح ڈالنے میں عظمت اللہ خان کے بعد اُن کا دوسرا نام ہے۔ بچوں کے گیتوں کے سات مجموعے چھپے۔ ''ہزار داستان اور محزن'' جیسے بڑے ادبی جریدوں کے بھی مدیر رہے۔ آپ کی ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومتِ پاکستان کی جانب سے ہلالِ امتیاز اور حُسنِ کارکردگی کا صدارتی ایوارڈ بھی ملا۔

آپ کی تصانیف میں سب سے اہم 'شاہنامہ اسلام' ہے جسے خوب قدر و منزلت حاصل ہوئی۔ جو ایک صدی گزر جانے کے بعد آج بھی اُردو ادب میں ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ شاہنامۂ اسلام چار جلدوں میں شائع ہوا۔

نظموں، گیتوں اور غزلوں پر مجموعے درج ذیل ہیں۔

''نغمہ زار، سوز و ساز، تلخابہ شیریں، پھول مالی، بزم نہیں رزم، چراغِ سحر، تصویرِ کشمیر، بہار کے پھول''۔ افسانوں کا مجموعہ 'ہفت پیکر'' کے نام سے چھپا۔ اُن کی ایک معلومات افزا کتاب ''چیونٹی نامہ'' بھی لکھی۔ یہ حفیظ جالندھری کی آخری کتاب تھی۔

یہ کون ذی وقار ہے، بلا کا شہسوار ہے　　جو ہے ہزاروں قاتلوں کے سامنے ڈٹا ہوا
یہ یا لیقین حسین ہے، نبی ﷺ کا نورِ عین ہے　　جو ہے ہزاروں قاتلوں کے سامنے ڈٹا ہوا

پاکستان کے قومی ترانہ اور شاہنامہ اسلام کے خالق حفیظ جالندھری 21 دسمبر 1982ء کو لاہور میں 82 سال کی عمر میں وفات پا گئے۔

ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات یاد نہ تم کو آسکے　　تم نے ہمیں بھلا دیا ہم نہ تمہیں بھلا سکے

مولانا الطاف حسین حالی

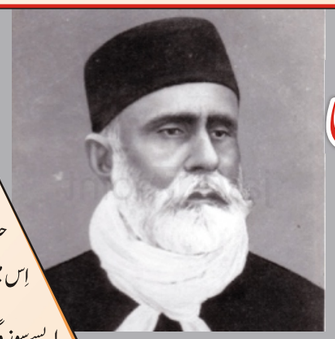

پروفیسر عفت گُل اعزاز

مولانا الطاف حسین حالی 1837ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام خواجہ ایزد بخش تھا۔ نو برس کے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ قران مجید ختم کر کے فقہ، حدیث، فلسفہ، منطق کی تعلیم پا رہے تھے کہ شادی ہوگئی۔ 1854ء میں دہلی جا کر مولوی نوازش علی سے مزید کتابیں پڑھیں۔ 1855ء میں واپس پانی پت آ گئے اور 1856ء میں کلکٹر حصار کے دفتر میں ملازمت اختیار کر لی۔ 1857ء کے ہنگامے میں پھر پانی پت آ گئے۔ وہاں چار برس رہ کر دہلی گئے اور نواب مصطفیٰ خان شیفتہ رئیس جہانگیر آباد کے بیٹوں کی اتالیقی پر مامور ہو گئے۔ یہ خدمت آٹھ سال تک جاری رہی۔ نواب صاحب کی صحبت سے شاعری کا شوق جو کہ دَب گیا تھا، تازہ ہوا اور غالبؔ کو اپنا کلام دکھانے لگے۔ بعد ازاں تلاشِ روزگار میں لاہور پہنچے جہاں سررشتۂ تعلیم میں 15 روپے ماہوار پر اُن کتابوں کی عبارت درست کرنے کی ملازمت مل گئی جو انگریزی سے اُردو میں ترجمہ ہوتی تھیں۔ یہاں ڈائریکٹر تعلیمات کرنل ہالرائڈ کی سرپرستی میں مولانا محمد حسین آزادؔ نے ایک ماہانہ مشاعرہ قائم کیا جس میں بجائے غزلوں کے قومی اور نیچرل نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔ حالیؔ نے یہاں اپنی کئی مشہور نظمیں پیش کیں۔ چند ماہ چیفس کالج میں مدرس بھی رہے۔ چار سال کے بعد 1890ء میں اینگلو عربک سکول دہلی میں مدرس مقرر ہوئے۔ دہلی میں سرسید احمد خان سے نیاز مندی رہی۔ سرسید کی تحریک پر اپنی مشہور مسدس ''مدجزر اسلام''، لکھی۔ 1887ء میں جب نواب سر آسمان جاہ، علی گڑھ آئے تو سرسید نے اُن کا تعارف کرایا اور حکومتِ نظام سے اُن کا 75 روپے ماہانہ علمی وظیفہ مقرر ہو گیا۔ پھر جب علی گڑھ کالج کے ایک وفد کے ساتھ حیدر آباد گئے تو وظیفہ 100 روپے کر دیا گیا۔ اب ملازمت ترک کر کے پانی پت آ گئے اور ہمہ وقت تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے۔

اُن کا لڑکپن اور جوانی دہلی میں بسر ہوئے۔ دہلی اُس وقت علم و فن کا مرکز تھی۔ حالیؔ کو غالبؔ، شیفتہؔ اور سرسید کی صحبت ملی۔ بعد میں وہ لاہور آ گئے اور پنجاب بک ڈپو میں ملازمت کر لی۔ انہوں نے جدید طرز کی نظمیں لکھیں اور اُردو شاعری کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا۔ اُن کی تحریر کی خوبی سادگی، دل کشی اور مدلل اندازِ بیاں ہے۔ مولانا حالیؔ نے سرسید کی تحریک پر نظم 'مدو جزر اسلام (مسدس حالی)' لکھی جو اُردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔ اِس میں حالیؔ نے مسلمانوں کی گم شدہ عظمت اور جلال کو ایسے سوز و گداز کے ساتھ پیش کیا ہے جو دلوں پر اثر کرتا ہے۔ یہ پُر درد نغمہ دلوں کو پگھلانے لگتا ہے اور چشمۂ ہدایت کی طرف لے جاتا ہے۔ اِس نظم میں حضور ﷺ سے عقیدت اور محبت کا ذکر ہے۔ اِس جہاں کے بُت کدے میں اسلام کا نور پھیلا اور یہ اُمت اپنے عروج کو پہنچی مگر پھر اپنی بے اعتدالیوں اور کوتاہیوں سے روبہ زوال ہونے لگی۔ انہوں نے بڑی دردمندی سے قوم کی حالتِ زار کا نقشہ کھینچا ہے۔ مولانا نے مسلمانوں کے اخلاق و عادات، اُن کی معاشرت، اطوار و اشغال کا ذکر کیا ہے۔ ہر طبقے کی افسوس ناک حالت اور اُس کی بداعمالیاں خاص انداز سے بیان کی ہیں کہ ہر غیرت مند مسلمان پڑھ کر بے تاب ہو جاتا ہے۔ اِس نظم سے مسلمانوں میں احساسِ زیاں پیدا ہوتا ہے اور ساتھ ساتھ قوتِ عمل، ذوق اصلاح اور جوش انقلاب بھی نظم میں زبان کی سادگی و شیرینی کے ساتھ اعلیٰ ملی اقدار کے احیاء کا پیغام ہے۔

علامہ اقبالؔ کے ارشاد کے مطابق "برعظیم کی اصلاحی تحریک میں مولانا حالیؔ کا مقام سرسید احمد خان کی طرح بلند اور اہم ہے۔

سرسید احمد خان ''مسدسِ حالی'' سے اتنے متاثر ہوئے کہ اُن کے منہ سے نکلا: جب خدا پوچھے گا کہ تُو کیا لایا؟ "میں کہوں گا حالیؔ سے مسدس لکھوا لایا ہوں۔"

حالیؔ نے قوم کو متنبہ کیا کہ مسلمان ہندوؤں سے الگ قوم ہیں اور اُن کا ماضی بڑا شان دار تھا اور اب انھیں جدوجہد کرنی ہے تا کہ اپنے مستقبل کو روشن کر سکیں۔

حالیؔ کی ادبی و علمی خدمات کی وجہ سے انھیں ''شمس العلماء'' کا خطاب دیا گیا۔ اُن کی مشہور کتابیں: حیاتِ جاوید، یادگارِ غالب، حیاتِ سعدی، مقدمہ شعر و شاعری اور مدو جزر اسلام (مسدس حالی) ہیں۔ مولانا الطاف حسین حالیؔ کو برِصغیر کے مسلمانوں کی حالتِ زار پر جو مایوسی تھی اس میں انھیں سرسید احمد خان کی شخصیت میں ایک اُمید کی کرن نظر آئی اور انہی کی تحریک پر الطاف حسین حالیؔ نے ''مسدس'' اور ''مدو جزر اسلام'' تصنیف کی۔

حالیؔ نے اپنی غزلوں میں وطن کی حالت اور اِس کے ساتھ مسلمانوں کی دین سے دوری پر بھی ہمیشہ اظہارِ غم کیا ہے۔

بگڑی ہوئی ہے کچھ اِس باغ کی ہوا
یہ باغ کو رہے گی نہ ویراں کئے بغیر

الطاف حسین حالیؔ کا انتقال 31 دسمبر 1914ء میں ہوا۔

بشکریہ نیشنل لائبریری

بغاوتِ زنگیان

محمد سعید احمد شیخ

کتبِ تاریخ کے مطابق عربوں اور ایرانیوں کا براعظم افریقہ کے باسی سیاہ فام باشندوں سے اوّلین واسطہ آٹھویں صدی عیسوی کے اَواخر میں پڑا جب ارکان خلافتِ عباسیہ اور اَشرافیہ کے دیگر طبقات نے دجلہ، فرات اور دیگر دریاؤں سے ملحقہ دلدلی علاقوں سے شورہ اکٹھا کرنے، اِن دریاؤں سے نہریں نکالنے، وہاں کی بنجر زمینوں کو قابل کاشت بنانے اور پھر اُن میں گنا اور دیگر فصلات اُگانے کے سخت محنت طلب کام کی ادائیگی کیلئے شمالی اور وسطی افریقہ سے ہزاروں کی تعداد میں سیاہ فام باشندوں کو بطور غلام خرید کر اپنے ہاں آباد کیا۔

براعظم افریقہ کے مختلف حصوں سے بطور غلام خرید کر لائے گئے اِن سیاہ فاموں کی مقامی لوگوں کے مقابلے میں سخت اور کسی حد تک بہیت ناک جسمانی وضع قطع، اِنکی غیر معمولی صفتِ بے باکی اور سب سے بڑھ کر مقامی سیاسی اور عسکری ریشہ دوانیوں اور سازشوں سے اِن کی عدم واقفیت اور اُن میں شمولیت کا عمومی رجحان نہ رکھنے کے سبب کچھ امراء نے انہیں فن حرب سکھا کر اپنی سپاہ کا حصہ بھی بنایا۔ خود مرکزی عباسی سپاہ کا بھی کچھ نہ کچھ حصہ اِن سیاہ فاموں پر مشتمل تھا۔

تاہم اَشرافیہ کے ہاں بولی جانے والی مرصع عربی اور فارسی زبانوں سے عمومی طور پر نابلد اِن سیاہ فاموں کی سماجی حالت بڑی رحم طلب تھی۔ حقارت کا شکار اِن منفرد الصبغہ غلاموں سے دن رات سخت مشقت لی جاتی اور انہیں 'حصہ بقدر جثہ' کے مطابق عزت اور احترام سے کھانے پینے کو کچھ ملنا تو درکنار محض جسم اور جان کا رشتہ برقرار رکھنے کیلئے درکار کھانے کو بھی دستیاب نہیں ہوتا تھا۔

اطلس، مشروع، زربفت اور کمخواب پہننے والی اشرافیہ کے یہ غلام ننگے پاؤں ٹاٹ لگے تہمند باندھ کر تپتی دھوپ میں سارا سارا دن اپنے جسم جھلساتے رہتے۔ جس زمین کو آباد کرنے یا جس کھلیان کی مزرعت کرنے کا اِن سے کام لیا جاتا تھا، یہ وہیں پر ہی جھونپڑی نما خیموں میں مقیم رہتے تھے۔ شہری آبادیوں اور وہاں کی سہولیات کے ساتھ اِن بدنصیبوں کا لینا دینا کم ہی رہتا تھا۔ سپاہ کا حصہ بننے والے سیاہ فام بھی بالعموم پیدل فوج (Infantory) تک ہی محدود رہتے تھے اور اِن میں سے کوئی گھڑسوار دستے میں شامل ہونے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ گھڑسواری صرف عربوں، ایرانیوں، تورانیوں اور ترکوں کا استحقاق سمجھی جاتی تھی۔

گو کہ سیاہ فام افریقی غلاموں کے ساتھ ہونے والا یہ غیر مساویانہ، امتیازی اور ابتر سماجی سلوک شریعتِ محمدی ﷺ کے غلاموں کے حقوق بارے احکامات کے صریحاً برخلاف تھا تاہم فقیہانِ خلافتِ عباسیہ اور اشرافیہ کے گٹھ جوڑ کے سبب اِن غلاموں کے استحصال کے خلاف آواز اٹھانے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ اور یوں اِن غلاموں کا یہ جبر و استحصال اوّل اوّل نصف صدی سے بھی زائد عرصہ تک بلا روک ٹوک جاری و ساری رہا۔ اِس طویل عرصے میں جہاں اشرافیہ کی ایک نئی نسل میدانِ عمل میں آ گئی وہاں یہ سیاہ فام بھی اب 'غلام ابن غلام' کے طور پر اپنا پسینہ دجلہ اور فرات کے دلدلی اور شورزدہ علاقوں میں بہانے لگے۔

فارسی بولنے والوں نے اِن سیاہ فام افریقیوں کو 'زنگی' کا نام دیا۔ یہ نام لوہے اور تانبے وغیرہ پر لگنے والے زنگ کی رنگت کی مناسبت سے تجویز کیا گیا تھا جو اِن غلاموں کی رنگت کی طرح سیاہ اور سرخ کا مغلوبہ (Mixture) تھا۔ تاہم عربوں نے 'گ' کو 'ج' میں بدلنے کی اپنی صفت کے سبب انہیں 'زنجی' کا نام دیا، جیسا کہ ابن البلخی نے اپنی مشہورِ زمانہ کتاب 'فارس نامہ' میں لکھا ہے:

''و در لفظ عرب ہر چہ بپارسی گاف باشد، جیم گویند چنانک زنگی را زنجی گویند و زنگ را زنج۔''[4]

(ترجمہ:) اور عرب ہر اُس لفظ کو جو فارسی کے 'گ' پر مشتمل ہو، 'ج' کے ساتھ بولتے ہیں۔ جیسا کہ وہ 'زنگی' کو 'زنجی' اور 'زنگ' کو 'زنج' کہتے ہیں۔

تاہم یہی زنگی اپنی سیاہ رنگت اور منفرد خدوخال کے علاوہ ایک اور نسبت سے بھی 'مشبہ بہ' (وہ چیز جس کے ساتھ کسی دوسری چیز کو تشبیہ دی جائے) ٹھہرے۔ گو کہ اِس نئی نسبت کا رواج اِن زنگیوں کی دوسری نسل یعنی 'غلام ابن غلام' کہلائی جانے والی پَود نے ڈالا، تاہم اِس کی شدت کے سبب آنے والی کئی

صدیوں تک اِس کا اطلاق دنیا بھر کے زنگیوں پر بلاتفریق کیا جاتا رہا۔

اِس نسبت نے ایک انتہائی سفاکانہ اور بے رحمانہ بغاوت کی کوکھ سے جنم لیا جو نویں صدی عیسوی کے اواخر میں اِن زنگیوں نے خلافتِ عباسیہ کی حدود کے اندر برپا کی۔ کئی ایک مسلمان مؤرخین نے زنگیوں کی اِس خوفناک شورش کو تاریخِ اسلامی کی سب سے بڑی بغاوت قرار دیا ہے۔ مسلسل چودہ سال (۸۶۹ء تا ۸۸۳ء) تک جاری رہنے والی اِس بغاوت میں ہلاک ہونے والے افراد کی مجموعی تعداد کو مختلف تذکروں میں پندرہ لاکھ تک بھی بیان کیا گیا ہے۔ محتاط مؤرخین نے بھی ہلاکتوں کی تعداد کم از کم تین لاکھ تک لکھی ہے۔

سیاہ فاموں کی اِس بغاوت کو عرب تذکروں میں 'ثورہ الزنج' جبکہ فارسی کتبِ تاریخ اور تذکرہ جات میں اِسے 'بغاوتِ زنگیان' یا 'فتنۂ زنگیان' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ گو کہ اِس بغاوت کا اوّلین مرکز خلافتِ عباسیہ کا اہم تجارتی شہر بصرہ تھا تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ بغاوت دیگر علاقوں میں بھی برابر پھیلتی گئی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ڈیڑھ عشرے کے لگ بھگ پوری خلافتِ عباسیہ اِن سیاہ فام غلاموں کی شورش کے باعث ایک طرح سے مفلوج بنی رہی۔

زنگیوں کی اِس بغاوت کا سرخیل علی بن محمد نامی ایک انتہائی شقی القلب اور مفسد، مگر بلا کا ذہین ایک عرب تھا جسے مسلمان مؤرخین نے 'صاحب الزنج' کا نام دیا ہے۔ علم الکلام اور صرف ونحو میں ماہر اِس فتنہ پرور آدمی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ بچپن سے ہی اپنی حکومت اور اَمارت قائم کرنے کے خبط اور جنون میں مبتلا تھا۔ شمالی عراق کے زنگی غلاموں کی ناگفتہ بہ حالت اور بصرہ کی سیاسی ابتری دیکھ کر اُسے اپنے تئیں یہ اندازہ لگانے میں کوئی تامل نہ رہا کہ اگر وہ اِن غلاموں کو کسی طور اپنے گرد اکٹھا کر لے تو اُس کا جائز و ناجائز طریقے سے حکومت سازی کا خواب پورا ہو سکتا ہے۔

چنانچہ یہی خواب آنکھوں میں سجائے یہ علی بن محمد ۸۶۸ء کے لگ بھگ بحرین سے بصرہ پہنچا۔ اِس نے اپنا شجرۂ نسب علی ابن محمد بن احمد بن علی بن عیسیٰ بن زید بن علی بن الحسین بن علی بن ابی طالب بیان کرنے کے بعد خود کو علوی ظاہر کیا۔ اپنی چرب زبانی کے سبب خود آزاد ہونے کے باوجود یہ بدترین غلامی کا شکار ہزاروں زنگیوں کا اللہ واسطے کا خیر خواہ اور اُن کا ایک طرح سے خود ساختہ آقا بن گیا۔ اِس نے باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت بصرہ پہنچتے ہی یہ اعلان کروا دیا کہ جو بھی زنگی غلام اُس کے پاس چلا آئے، وہ آزاد سمجھا جائے گا اور اِس آزادی کا ضامن بھی وہ خود ہوگا۔ اِس اعلان کو سن کر زنگی غلاموں کا انبوہِ کثیر اُس کے زردرنگ کے جھنڈے تلے جمع ہو گیا۔

اپنے اردگرد جمع ہونے والے غلاموں کو حوصلہ دینے کیلئے علی بن محمد نے ایک منفرد چال یہ چلی کہ اُس نے اِن کے آقاؤں کو یہ زنگی غلام لوٹانے کے حیلے بہانے سے خط و کتابت کے ذریعے اپنے پاس بلوانا شروع کر دیا۔ جونہی کوئی آقا اپنے محافظوں کے ہمراہ اُس کے پاس پہنچتا، اُس کے تجربہ کار ساتھی اُن سب کو دبوچ کر قیدی بنا لیتے۔ دو ہفتوں کے اندر درجنوں اُمراء کو خاموشی سے قیدی بنا لیا گیا۔ پھر ایک مقررہ دن پر مشروع، زربفت، مخمل اور اطلس کی قبائیں پہنے ان اُمراء کو نگ دھڑنگ سیاہ فام غلاموں نے رسیوں اور زنجیروں سے جکڑ کر اپنے نئے آقا کے سامنے لا کھڑا کیا۔ گو کہ علی بن محمد نے اُن سب کی رہائی کا حکم جاری کیا تاہم زنگیوں کے ہاتھوں اُمراء کی گرفتاری کے اِس واقعہ نے اِن غلاموں کے اندر بغاوت کی ایک نئی رُوح پھونک دی۔

علی بن محمد کے جھنڈے کے نیچے زنگی غلاموں کی جمعیت روز بروز ترقی کرتی گئی۔ عباسیان بغداد کی مرکزی سپاہ کے پیدل فوجی دستوں میں شامل زنگی بھی ٹوٹ ٹوٹ کر اپنے اِس نئے آقا کے گرد جمع ہونے لگے۔ وہ اپنی تقریروں سے اِن کا خون گرماتا اور اُنہیں ملک گیری اور تیغ زنی کی ترغیب دیتا رہا۔ اِس نئے آقا نے بصرہ کے نزدیک اپنا ایک دارالحکومت بھی بنا لیا جس کا نام 'المختارہ' رکھا گیا۔

رفتہ رفتہ شمالی عراق کے کئی حصوں میں علی بن محمد کے معتمدین باغی زنگی غلاموں کی مدد سے قلعہ بندی کرنے لگے۔ اپنے پاس موجود تربیت یافتہ زنگی جنگجوؤں کی مدد سے اُس نے خود پہلے قادسیہ اور اُس کے مضافاتی علاقوں کو لُوٹا اور پھر بصرہ پر یلغار کر دی۔ اہلِ بصرہ نے مقابلہ کیا مگر شکست کھائی۔ 'تاریخ سیوطی' کے مطابق بصرہ پر قبضہ کے دوران اِن زنگیوں نے اِس قدر قتلِ عام کیا کہ مُردوں کا دفن کرنا مشکل ہو گیا اور لاشوں کے تعفن سے سخت وبا پھیل گئی۔

عباسی خلیفہ المعتمد باللہ کے زمانے میں 'صاحب الزنج' کی قوت اِس قدر زیادہ بڑھ گئی کہ اِس نے بصرہ کے بعد ابلہ، ابادان، اہواز، واسط وغیرہ جیسے بڑے شہروں پر بھی اپنا تسلط مکمل کر لیا۔ مختلف تجارتی راستوں اور حفاظتی چوکیوں کے حصار سے آزاد دُور دراز کے دیہاتی علاقوں پر اِس کے زنگی ساتھیوں کی مار دھاڑ الگ سے جاری رہی۔ خلافتِ عباسیہ کے طول و عرض میں عام لوگوں کے خوف و ہراس کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے گھروں سے باہر نکلنا تک ترک کر دیا۔

گو کہ بصرہ سے شروع ہونے والی اِس بغاوت کا اوّلین نشانہ زنگی غلاموں کے آقا، اُن کے متعلقین اور عباسی سپاہ تھی، تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہر عام و خاص کو اِن زنگیوں کے غیض و غضب نے آن گھیرا۔ محرومیوں، بھوک، افلاس اور انتقام کی آگ میں جلتے سیاہ فام زنگی جتھوں کی شکل میں شہروں، دیہاتوں اور تجارتی و انسانی قافلوں پر حملہ آور ہوتے، سامنے آنے والی ہر شے کو تہس نہس کرتے، عمارتوں اور مال و اسباب وغیرہ کو نذرِ آتش کرتے، مردوں، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں وغیرہ سب کی بلاتفریق گردنیں کاٹتے اور یہ جا اور وہ جا۔

لاکھوں بے گناہ لوگوں کی جانیں لینے کے بعد زنگیوں کی یہ خون آشام بغاوت بالآخر ۸۸۳ عیسوی میں عباسی ولیٔ عہد الموافق باللہ کی قیادت میں عباسی سپاہ کے ہاتھوں علی بن محمد کی ہلاکت اور اُس کے کٹے سر کی نیزے کی نوک پر ہفتوں مختلف شہروں میں نمائش کے بعد کہیں جا کر فرو ہوئی۔

'تاریخِ طبری'، 'تاریخ مسعودی' اور دیگر کتبِ تاریخ میں اِن زنگیوں کی بربریت، سفاکی اور سنگ دلی سے متعلق ایسے عجیب و غریب واقعات رقم ہیں جنہیں پڑھ کر دل دہل کر رہ جاتا ہے۔ مثلاً کئی ایک مؤرخین نے لکھا ہے کہ یہ چوہے، کتے، بلیاں اور یہاں تک کہ عام قیدیوں کو بھی قتل کر کے اُن کی لاشیں بُھون کر کھا جاتے تھے۔ اور تو اور دورانِ محاصرہ جب کوئی زنگی کسی منجنیق کا پتھر یا تیر لگنے کے سبب ہلاک ہو جاتا تو اُسکی لاش بھی مٹی تلے دفن ہونے کی بجائے اِنہی کی خوراک کے کام آتی۔ یعنی ہر غیر اور دشمن کی طرح اِن کے کسی اپنے کی لاش بھی اِن کیلئے مباح ہوتی اور وہ اِنہی کے پیٹ کے دوزخ کا ایندھن بنتی تھی۔

یہ زنگی اپنی سفاکیت اور سنگدلی کے سبب سے قلعہ بند لڑائی میں بھی سب سے سبقت لے گئے۔ عام فریقین کے برعکس (جو لاشیں گرنے اور سامانِ خورد و نوش کی کمی کے سبب سے بوکھلاہٹ کا شکار ہوتے تھے)، کسی قلعہ میں محصور زنگیوں کی جتنی زیادہ لاشیں گرتیں، اِن کی قلعہ بند مزاحمت بھی اُسی قدر طوالت اختیار کرتی جاتی تھی۔

نویں اور دسویں صدی عیسوی میں بالخصوص اور اِن کے بعد میں آنے والی صدیوں میں بالعموم یہ زنگی خوف اور دہشت کا بھرپور استعارہ بنے رہے۔ نمونے کے طور پر مولانا جلال الدین رومیؒ، خاقانی اور فریدالدین عطارؒ کا ایک ایک شعر بالترتیب ملاحظہ ہو:

ای چرخ ہیچو زنگی خون خوارہ خلایق
من ابر ہیچو خویم بر تو چرا بریزم

(ترجمہ:) اے آسمان! تو کسی زنگی کی طرح مخلوق کا خون پینے والا ہے اور میں اپنے مزاج کے جیسا ایک بادل ہوں، میں تجھ پر کس طرح برسوں؟

ہندی او آدمی خوار ہیچو زنگی در مصاف
مصری او تیز منطق چون عرابی در سخا

(ترجمہ:) اُس کا ہندوستانی (اژدھا) جنگ میں مبتلا کسی زنگی کی طرح مخلوق کا خون پینے والا تھا تو اُس کا مصری (سانپ) سخاوت میں پڑے کسی اعرابی کی طرح تیز عقل۔

فلک از میغ گوہر بار گشتہ
ہوا زنگی مردم خوار گشتہ

(ترجمہ:) آسمان بادل کے سبب بوندوں کے موتی برسانے والا بنا تو ہوا انسانوں کا گوشت کھانے والے کسی زنگی (کے جیسی) ہوگئی۔

بوچو یا مورا

ترجمہ: پیر علی محمد راشدی

اُس بوڑھے ماہی گیر میں
جو ساحل پر ایڑیاں جمائے کھڑا ہے
مجھے ایک انسان نظر آ رہا ہے
سمندر سے اُس کا عشق رہا ہے
اب بوڑھا ہو چلا ہے
مگر کتنا عرصہ اپنے محبوب سے ہم آغوش رہ چکا ہوگا
اِس بوڑھے ماہی گیر کا
سمندر سے عشق رہا ہے
اُس سمندر سے جو خود بوڑھا ہونے کا نہیں
عاشق خود بوڑھا ہو چکا ہے
پر اپنے اِس ہمیشہ جوان معشوق کی طرف
استقلال سے پاؤں جمائے ہوئے
ہمت سے آنکھیں اٹھائے ہوئے
دیکھ رہا ہے
راہِ محبت میں۔۔۔
اِس بوڑھے کی ثابت قدمی
سمندر کی طرح بے کراں ہے
نہیں نہیں،،،،، سمندر سے بھی زیادہ ہیں
اِس کی ثابت قدمی کی گہرائیاں اور پہنائیاں!!
تعجب کی بات ہے کہ اِس قدر ثابت قدمی
ایک انسان میں نظر آ رہی ہے
دیکھ لے سمندر، تُو بھی دیکھ لے
ایک انسان دیکھ لے
اُس انسان کے اعصاب دیکھو
آہنی ہیں،
جسم دیکھو
تانبا ہے،
آنکھیں دیکھو
شعلے جھڑ رہے ہیں کان ابرو سے
چہرہ دیکھو
وہ گہری اور موٹی لکیریں
نقشہ ہیں ساری انسانیت کا
دیکھ لے سمندر!
دیکھ لے
تُو بھی ایک انسان دیکھ لے!

بشکریہ نیشنل لائبریری اسلام آباد

دسمبر جہاں محبت مزاج لوگوں کا مہینہ ہے وہاں سردی کا مہینہ بھی ہے اور یہ دونوں دل کے بہت قریب ہیں، ہمیشہ سے! لیکن اِس مرتبہ غریب الوطنی نے میرا جھکاؤ سردی کی طرف سِرکا دیا تو دل کہیں پیچھے رہ گیا۔ ہوا کچھ یوں کہ مَیں جلدی میں غمِ دوراں کے چکر میں گرم چادر اور گرم جیکٹ اپنے آبائی گھر بھول آیا۔ جیکٹ سے یاد آیا کہ یہ جیکٹ مَیں نے دارالحکومت کے سب سے پوش علاقے میں قائم کباڑ مطلب لنڈے سے بڑے چاؤ سے خریدی تھی۔ یہ اعلیٰ قسم کے چمڑے سے بنائی گئی تھی۔ بہت گرم تھی اور خریدنے کے بعد جس دن مَیں اُسے پہن کر کام پہ گیا تو مجھے اپنا آپ کسی انگریز سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ مَیں ایک خاص ٹھاٹ اور مستی میں کام کی جگہ پہنچا۔ جیسے ہی مجھے میرے ساتھ کمرے میں بیٹھنے والے ساتھی نے دیکھا اُس کی آنکھیں کھلی کی کُھلی رہ گئیں اور وہ حیران و ششدر اپنی سیٹ سے اُٹھا اور گلے لگا کر کہا ''بہت زبردست جیکٹ پہنی ہوئی ہے''۔ مَیں بہت خوش ہوا لیکن اگلے ہی لمحے میری خوشی کافور ہوگئی جب ساتھ بیٹھے دوسرے شخص نے کہا کہ ''یہ جیکٹ اتنی خاص تو نہیں ہے کہ آپ ایسے کھڑے ہو کر ملیں۔ ہاں البتہ ایک بات ہے اگر یہ اس چمڑے کی جیکٹ کو پالش کر دیں تو پھر کیا بات ہوگی اس جیکٹ کی۔ کوئی بھی اُسے نہیں پہچان سکے گا کہ یہ نئی ہے یا اِس کے برعکس ہے''۔ مَیں بھی سوچ میں پڑ گیا۔ اُس دن کام سے جلدی چھٹی کی اور سیدھا جیکٹ پالش کرنے والی دکان پہ گیا۔ رنگ ساز کو جیکٹ دی اور اُسے کہا کہ اسے ایسے پولش کرنا ہے کہ یہ بالکل نئی لگے۔ رنگ ساز نے جیکٹ کا بغور جائزہ لیا اور بولا ''جیکٹ تو بہت قیمتی معلوم ہوتی ہے''۔ مَیں دل ہی دل میں بہت خوش ہوا لیکن اگلی بات نے مجھے پریشان کر دیا۔ رنگ ساز بولا ''اِس جیکٹ کی پالش نہیں ہوسکتی۔ بالکل بھی نہیں''۔

مَیں نے ناراضگی والے انداز میں پوچھا ''کیوں جناب؟ اتنی قیمتی جیکٹ ہے؟''

رنگ ساز نے کہا ''قیمتی تو ہے اِس میں شک نہیں لیکن یہ جس انگریز کی تھی وہ مجھے محبت مزاج انگریز لگتا تھا آپ کی طرح''۔ مَیں نے پوچھا کہ ''کیا مطلب''۔

رنگ ساز بولا ''لگتا ہے اُس انگریز نے اِسے بڑی محبت سے خریدا تھا اور جتنی محبت سے خریدا تھا اتنی محبت سے پہنا بھی''۔ مَیں خوش ہوا کہ شاید کوئی راستہ نکال رہا ہے لیکن اُس کے اگلے جملے نے میری ساری اُمیدوں اور خوشیوں کا خون کر دیا۔ وہ بولا ''انگریز نے اِس جیکٹ کا استعمال بہت محبت سے کیا بلکہ دیوانہ وار کیا اور اسے اتنا پہنا کہ یہ اتنی گھِس چکی ہے کہ اب یہ پالش کے قابل ہی نہیں رہی اور اِس پہ اب کوئی رنگ نہیں چڑھے گا''۔

مرتا کیا نہ کرتا مَیں مایوسی کی چادر لپیٹے واپس آیا اور بغیر پالش کے اسے پہنتا رہا۔

خیر قصہ مختصر، سوچا! اب دسمبر کی سردی اور بغیر جیکٹ یا کوٹ کے۔۔۔؟ تو مَیں نے اِس مرتبہ کافی غور و خوض کے بعد فیصلہ کیا کہ اِس مرتبہ پالش کے چکر میں نہیں پڑتا اور بڑے لوگوں کی طرح لمبا کوٹ اُسی پوش جگہ سے لیتا ہوں۔

کام کے بعد وہاں پہنچا۔ سردیوں کے دن تھے۔ پسند کرتے کرتے رات کافی ہوگئی لیکن آخر کار ایک دانہ پسند آ گیا۔ جیسے ہی مَیں نے اُٹھایا، دکاندار جھٹ سے بولا ''چشم بدور، یہ دانہ نصیب والوں کو ہی ملتا ہے۔ یہ آج ہی لاٹ سے نکالا ہے لیکن لوگوں کو قدر ہی نہیں ہے۔ آپ واحد خوش نصیب ہیں بلکہ جوہری ہیں۔ جوہری ہی کو جوہر کی قدر ہوتی ہے۔ بلکہ جیسے ہی آپ نے یہ دانہ اٹھایا، مَیں نے اپنی ناک کو دیکھا کہ اِس جوہری کو نظر نہ لگے اور فوراً نظرِ بد کا توڑ کر لیا۔'' جب مَیں نے پہنا تو دکاندار بولا ''ایک دم کلاس ون'' اور قدآور شیشے میں مجھے بھی اپنے آپ کو پہچاننے میں دقت ہوئی۔ بہت بارُعب شخصیت لگ رہا تھا۔ خوشی خوشی خریدا، پہنا اور ویگن سٹاپ کی طرف بڑی ٹھاٹ سے خراماں خراماں روانہ ہوا۔ کوٹ بہت گرم تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے سائبیریا کے علاقے کے لیے بنایا گیا تھا۔ مجھے یوں لگا کہ میرا پتلا اور نحیف بدن کوٹ کے ساتھ کسی پہلوان کا بدن لگ رہا تھا اور اِس بات کا احساس اُس وقت شدت اختیار کر گیا جب ویگن والے

نے آواز لگائی ''آجائیں سیٹھ صاحب، ایک سیٹ خالی ہے''۔مَیں سیٹھ کی طرح ویگن میں داخل ہونے لگا تو کنڈکٹر بولا ''سیٹھ صاحب کوٹ اُتار لیں'' سواریوں نے بھی یہی کہا کیونکہ کوٹ کے ساتھ وہاں سمانا مشکل تھا۔خیر مَیں نے نہ چاہتے ہوئے بھی کوٹ اُتارا،سیٹ پر بمشکل جگہ بنائی اور کوٹ جھولی میں رکھ لیا۔

اپنے سٹاپ پر اُترا تو کوٹ پھر پہن لیا۔رات کافی ہو چکی تھی۔سال کا آخری مہینہ گزر رہا تھا۔چاند بھی چھوٹی لکیر کی طرح نظر آرہا تھا۔گھپ اندھیرا تھا۔جیسے ہی مَیں گلی کی طرف مڑا،چوکیدار نے دُور سے سیٹی بجائی اور ساتھ ہی زوردار آواز لگائی ''خبردار! آگے آنے کی کوشش مت کرنا ورنہ گولی چلادوں گا''۔مَیں حیران رہ گیا کہ روزانہ تو مَیں آتا ہوں۔ اُسے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔شاید چوکیدار نیا ہے۔مَیں نے دُور سے اپنا تعارف کروایا تو چوکیدار تو وہی پرانا چوکیدار تھا،فوراً پہچان لیا اور دُور سے بولا ''میں نے تو کہا کہ یہ پہلوان شخص تو ہمارے محلے کا نہیں، یہ کیا پہنا ہوا ہے؟ اتنی سردی تو نہیں ہے''۔ پھر سمجھ آئی کہ لمبے کوٹ نے میری پہچان مشکل کر دی تھی۔ خیر اُس سے علیک سلیک کے بعد آگے بڑھا۔گلی لمبی تھی ،آگے تو گلی میں کُتے بھونکتے ہوئے میری طرف لپکے اور مجھے ایک اِنچ بھی آگے بڑھنے نہیں دے رہے تھے۔مَیں نے بہت کوشش کی۔ پچکارسے،چٹکیوں سے اُن کی محبت اور پیار لینے کی بہت کوشش کی لیکن مجال ہے کہ اُن کے غصے اور بھونکنے میں کوئی فرق آئے۔آخر اِدھر اُدھر سے چھوٹے چھوٹے پتھر کے کنکروں سے کتوں کو بھگانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ یہ کیا ماجرہ ہے۔کتوں کے مستقل بھونکنے کی آواز کے باعث وہ چوکیدار وہاں سے آوازیں دے رہا تھا۔اُس چوکیدار نے زور سے سیٹی بجائی اور مجھے دُور سے آواز دی ''یہ پچھمنا کوٹ اُتارو پھر کتے آپ کو جانے دیں گے''۔لیکن اگر مَیں کوٹ اُتارتا ہوں تو میرے ہاتھ آستینوں میں آجاتے ہیں اور نیچے ایک ادھ پڑے کنکر تک نہیں پہنچ پاتے جس سے مَیں کتوں کو ڈراؤں۔ ایک عجیب کشمکش تھی۔ اتنے میں اِدھر اُدھر کے کُتے بھی بھونکتے ہوئے کتوں کے جمِ غفیر میں شامل ہونے لگے اور اُنہوں نے پورے محلے کو سر پہ اٹھالیا۔

اچانک ایک طرف سے ہوائی فائر ہوا ۔پھر کیا تھا آدھی رات اور فائر۔ آدھا محلّہ جاگ اٹھا اور آناً فاناً چور چور کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ اُن بے ہنگم آوازوں میں کہیں کہیں سے ''ڈاکو ہیں ڈاکو ہیں'' کا شور بھی بلند ہونے لگا۔لوگوں کو گلی میں دیکھتے ہی کتے بھونکتے ہوئے مجھے اکیلا چھوڑ کر اِدھر اُدھر بھاگ گئے۔ مَیں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی ۔کتوں کی جگہ لوگوں کا جم غفیر بے ہنگم حالت میں میری طرف بڑھنے لگا ۔ساتھ ہی'' چور چور، ڈاکو ڈاکو'' کا شور، کان پڑی اور کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ایک خوف سے میں ابھی پورا نکلا ہی نہیں تھا کہ ایک دوسرے خوف نے مجھے سرتاپا گھیر لیا۔اگلے لمحے مَیں زمین پر تھا۔شکر ہے کوٹ کافی موٹا تھا اور لاٹھیاں اور ڈھنڈے کوٹ کی وجہ سے ہڈیوں تک پُر اثر انداز میں نہیں پہنچ رہے تھے۔بے ہنگم آوازوں میں کبھی یہ آواز بھی سنائی دیتی ''احتیاط سے، اِس کے پاس اسلحہ ہوگا۔ اِس کے اور ساتھی بھی ہوں گے''۔کہیں کہیں سے یہ آواز بھی آجاتی ''دیکھیں آپ لوگ خود سزا اور جزا کا اختیار اپنے ہاتھ میں نہ لیں۔ محلے کا پورا چوکیداری نظام ہے۔ اِن کو اُن کے حوالے کر دیتے ہیں''۔لیکن کوئی کسی کی نہیں سن رہا تھا۔میری چیخیں نکل رہی تھیں جو

صرف مَیں ہی سن رہا تھا۔ محلے کے چوکیدار کی آواز کبھی کبھار مَیں سن لیتا اور اطمینان کا سانس نصیب ہوتے ہوتے رہ جاتا کیونکہ اُس کی بات اِس ناگہانی آفت میں سوائے میرے کسی کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔وہ کئی بار کہہ چکا کہ'' یہ مکھنڑا ہے،اسی محلے میں رہتا ہے''لیکن اُس کی کون سنتا۔کان پڑی آواز کسی کو سنائی نہیں دے رہی تھی۔کوئی مجھے بچا رہا تھا تو کوئی میری ہڈیوں کے توڑنے کے درپہ تھا۔کوئی مجھے اِس دنیا سے رخصت کرنے پہ تلا ہوا تھا۔اتنے میں دور سے کسی گاڑی کی آواز کسی نے سنی اور زور سے بولا ''وہ آگئے ہیں،مَیں نے فون کر دیا تھا کہ ہمارے محلے میں ڈاکہ پڑ گیا ہے''۔

مَیں ایک دفعہ پھر تھوڑا سا سنبھلا ہی تھا کیونکہ لاتیں، گھونسے اور ڈنڈے تھمنے لگے اور اگلے ہی لمحے مَیں نے اپنے آپ کو نسبتاً محفوظ ہاتھوں میں پایا۔ اُنہوں نے مجھے اُس جمِ غفیر سے بچایا اور ساتھ لے گئے۔

مَیں نیم بے ہوش تھا لیکن اُن کی باتیں مجھے سمجھ آرہی تھیں۔ اُن میں سے ایک بولا ''یہ چور اور ڈاکو اکثر دسمبر کے مہینے میں وارداتیں کرتے ہیں''۔ اُس کے ساتھی نے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا ''ہاں بالکل! ایک تو شدید سردی ہوتی ہے لوگ رضائیاں لے کر سروں کو ڈھانپ کر سو جاتے ہیں تو اُن کو پتہ ہی نہیں چلتا باہر کیا ہو رہا ہے''۔گفتگو جاری تھی اور ساتھ ہی اُن میں سے کسی ایک کی آواز میرے کان میں پڑی کہ ''ہاں اِس کے ساتھ ایک مسئلہ اور بھی ہے جو دسمبر سے وابستہ ہے کہ اِس مہینے میں لنڈا کباڑ عروج پہ ہوتا ہے اور وہاں سے اِن چورا چکوں، ڈاکوؤں کو یہ اِس قسم کے کوٹ بھی مل جاتے ہیں کہ انہیں پہن کر یہ اپنی ڈیل ڈول اور جسمانی ساخت اِس انداز میں بدل لیتے ہیں کہ بعض اوقات تو اُن کی بیوی بھی پہلے دن اِس کوٹ کے ساتھ انہیں نہیں پہچان پاتی۔ محلے کے یار دوست تو دور کی بات ہے۔''

مَیں تھوڑا سا ہلا اور بولنے کی کوشش کی لیکن مجھے اُنہوں نے پاؤں کے ٹھڈے سے خاموش کر دیا اور میری بات اُس غنچے کی صورت بِن کھلے مرجھا گئی جس کا ذکر شاعر کرتے ہیں اور میری بات کہ ''میرا حال بھی اِس دسمبر نے اور اِس کوٹ نے اِس طرح کر دیا ہے''جو حسرت کی صورت میرے دل میں رہ گئی اور مَیں بے خود ہو کر رہ گیا۔

''اِس کو دیکھو نا'' اُن میں سے ایک بولا ''اِس نے جو بہروپ بدلا ہے اور پتہ نہیں کتنی محنت اور تلاش بسیار کے بعد یہ کوٹ اِس نے آج ہی اِس واردات کے لیے خریدا ہوگا''۔''یار واقعی'' دوسرا بولا ''بالکل سائبیریا کا ریچھ لگ رہا ہے'' اتنے میں گاڑی رکی۔ مجھے تین سو دو کے ملزم کی طرح نیچے اُتارا گیا۔میرا ہر جوڑ درد کر رہا تھا۔اندھیرا تھا۔لوڈ شیڈنگ بھی تھی لیکن مجھے اتنا اندازہ ہوا کہ پرائیویٹ دفتر تھا۔ وہ اِس محلے کے چوکیداری نظام کے تحت قائم تھا۔ہم ابھی صحن میں تھے کہ ہماری گلی کا چوکیدار بھی پہنچ گیا کیونکہ مَیں اُس کے موٹر سائیکل کی آواز پہچان گیا۔اُس نے فوراً آواز لگائی ''یار چھوڑ دو اسے پولیس کے حوالے نہ کرو۔ اپنا مکھنڑا ہے جو وہاں نتھو کی بیٹھک میں کرائے پر رہتا ہے۔غریب آدمی ہے اور کسی دفتر میں کلرک ہے''۔ وہاں موجود لوگ ہنسے اور بولے'' اچھا اپنا مکھنڑا ہے مکھنڑا۔لیکن اِس کوٹ میں تو کوئی اجنبی مخلوق لگ رہا ہے''۔میری جان میں جان آئی لیکن کوٹ سے جان گئی کیونکہ مَیں نے سب سے پہلا کام جو کیا وہ اپنا کوٹ اُتارنا تھا۔

کورٹ کا اُتارنا تھا کہ سارے موجود لوگوں کا ملا جلا تاثر مَیں نے نوٹ کیا۔کوئی پشیمان اور کوئی ہنسی سے لوٹ پوٹ۔سب نے مجھ سے معذرت کی اور مَیں نے کوٹ سے۔ پھر دسمبر میں عمر بھر کباڑ کا لانگ مطلب لمبا کوٹ کبھی نہیں پہنا اور پھر موسم بھی میرا وفادار ساتھی بن گیا۔ دسمبر میں بھی موسمیاتی تبدیلی کے بدولت تھوڑی سی گرمی پڑنے لگی اور میری طرح کے بہت سے لوگ رات کو پٹائی سے بچ گئے بلکہ عمر بھر کے لیے بچ گئے۔

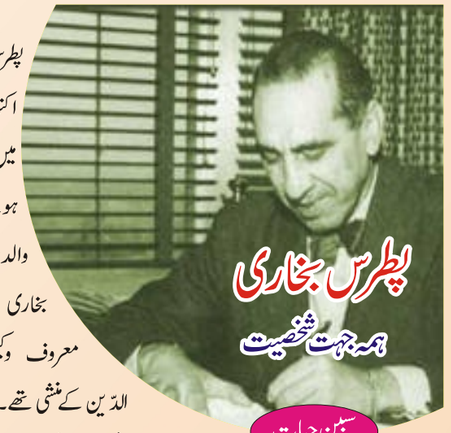

پطرس بخاری یکم اکتوبر 1898ء میں پشاور میں پیدا ہوئے ۔اُن کے والد سید اسد اللہ شاہ بخاری پشاور کے ایک معروف وکیل خواجہ کمال الدّین کے منشی تھے۔اُس زمانے کے روایت اور خاندانی روایات کی پاسداری کرتے ہوئے گھر ہی میں ناظرہ قران پاک کی تعلیم حاصل کی۔اُس زمانے میں فارسی زبان کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے ''صفوۃ المصادر'' کے ذریعے فارسی زبان کے قواعد کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔دینی اور ثقافتی بنیاد فراہم کرنے کے بعد والد نے آنے والے دور کے تقاضوں کو بھانپتے ہوئے دوستوں اور خیر خواہوں کے اعتراضات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے پطرس بخاری کو نو سال کی عمر میں انگریزی تعلیم کے لیے مشن اسکول پشاور میں داخل کرادیا۔مشن اسکول میں داخل ہوتے ہی انہوں نے انگریزی نظمیں زبانی یاد کرنا شروع کردیں۔اُس زمانے میں انگریزی کے اُستاد انگریز ہوتے تھے۔احمد شاہ کی آواز ،انگریزی لہجے اور خوبصورت تلفظ کے سبب اُن کی انگریزی نظم خوانی پر اساتذہ خصوصی توجہ دیتے تھے۔اِس طرح انگریزی ادب مانوسیت نے دلی لگاؤ کی کیفیت پیدا کردی۔پطرس بخاری نے مشن ہائی سکول میں تعلیم کے اعلیٰ معیار سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور 1913ء میں 15 برس کی عمر میں میٹرک میں اعلیٰ نمبروں سے کامیابی حاصل کی۔والد صاحب نے انہیں 1914ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ دلوایا جہاں وہ شروع میں کم گو لیکن ہوشیار طالب علم کی حیثیت سے سامنے آئے۔وہاں انہوں نے 1916ء سے 1922ء تک تعلیم حاصل کی۔

پطرس بخاری 1925ء اور 1926ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان چلے گئے۔انہوں نے انگریزی ادب میں اعلیٰ ترین سند کے لیے کیمبرج یونیورسٹی کا انتخاب کیا اور کیمبرج یونیورسٹی کے ''عمانویل کالج'' میں انگریزی ادب میں TRIPOS کی سند اوّل درجے میں حاصل کی اور عمانول کالج کے سینیئر سکالر منتخب ہوئے۔وہ جنوبی ایشیا کے دوسرے طالب علم تھے جنہوں نے انگریزی ادب میں اوّل درجے کی سند حاصل کی۔

پطرس بخاری نے اپنی ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز سول اینڈ ملٹری گزٹ سے کیا۔وہ عموماً تنقیدی مضامین لکھتے تھے۔اُس وقت سول اینڈ ملٹری گزٹ ایڈیٹر M.E.Hardy تھے جو پطرس بخاری کو ایک کالم کا سو روپیہ معاوضہ ادا کرتے تھے جس کی قدر اُس زمانے میں تین تولے سونے سے زائد تھی۔

پطرس بخاری کا قلمی نام سب سے پہلے رسالہ ''کہکشاں'' کے ایک سلسلہ مضامین ''یونانی حکماء اور اُن کے خیالات'' کے لیے استعمال کیا۔اُن کے لکھے مضامین پطرس کے نام سے اپنے زمانے کے مؤقر رسائل و جرائد میں شائع ہوتے تھے۔اُن کی بیشتر تحریریں ''مخزن، راوی اور نیرنگِ خیال'' میں بھی شائع ہوتی رہیں۔

پطرس بخاری انگریزی زبان کے رموز، انداز اور مزاج سے اچھی طرح واقف تھے۔ اُنہوں نے اپنی اِس صلاحیت کو ترجموں میں بڑی چابکدستی سے استعمال کیا۔اُنہیں اُردو میں اظہار پر بھی پوری قدرت حاصل تھی۔اسی لیے اُن کے اُردو تراجم کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔وہ ترجمے کو میکانکی نہیں بلکہ تخلیقی عمل مانتے تھے۔

پطرس بخاری کے ترجموں میں افسانے بھی ہیں، ڈرامے بھی، فلسفیانہ مضامین بھی ہیں اور اوپیرا بھی۔اِس تنوع نے اُن کی ترجمہ نگاری کی صلاحیتوں کی تمام جہتوں کو اُجاگر کیا ہے۔ پطرس بخاری نے ترجموں کے لیے جن اہلِ قلم کی نگارشات کا انتخاب کیا اُس سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں ہے کہ اُس انتخاب میں اُن کے اندر چھپا ہوا اُستاد نمایاں ہے۔اِن ترجموں کا مقصد یہ نظر آتا ہے کہ پڑھنے والے عام افراد مغربی ادب کے شہ پاروں سے آشنا ہو جائیں اور طلبہ میں بھی مزید مطالعے کا شوق بیدار ہو۔دیگر صاحبِ علم میں ترجمہ کرنے کا ذوق پیدا ہو۔پطرس بخاری کی اِن کوششوں سے اُردو میں روز افزوں ترجموں کے دور کا آغاز ہوا۔

ڈرامے سے وابستگی اور تھیٹر کی چاٹ نے پطرس بخاری کی تقریباً ہر تحریر میں افسانوی انداز پیدا کردیا ہے۔اُن کے طبع زاد مضامین میں افسانہ پن ہر جگہ نمایاں ہے۔برستے ہوئے مینہ کی ایک گنگناتی بوند کا اثر بیان کرتے ہیں:

''مینہ موسلا دھار برس رہا ہے۔ندی نالے چڑھے ہوئے ہیں۔ہر طرف شام کی سی تاریکی چھائی ہوئی ہے۔درخت اور پودے ایک دُھلی ہوئی تصویر کی طرح اپنی سبزی میں زیادہ سبز اور اپنی پاکیزگی میں زیادہ صاف نظر آرہے تھے۔پھول اور پرندے نغمہ کی نکہت، رنگ و بو سب شاداں معلوم ہوتے ہیں۔اے میری آرزوؤں کی ملکہ میرا دل اداس ہے۔''

پطرس بخاری ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔اُن پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور جتنا بھی لکھیں اُن کی شخصیت اور علمی و ادبی خدمات کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔پطرس بخاری کی تخلیقات زیادہ تر متفرق مضامین، مکالموں، دیباچوں اور تقریروں کی صورت میں مختلف رسالوں میں بکھری ہوئی ہیں۔تاہم اُن کی زندگی میں صرف ''پطرس کے مضامین'' ہی شائع ہوسکی۔

مُنیر نیازی

اُردو اور پنجابی شاعری کے بادشاہ

مریم ارشد

ویراں ہے پورا شہر کوئی دیکھتا نہیں
آواز دے رہا ہوں کوئی بولتا نہیں

مُنیر نیازی 9 اپریل 1923ء کو خانپور ضلع ہوشیار پور میں پیدا ہوئے۔پورا نام محمد مُنیر خان۔ابتدائی تعلیم خانپور اور ساہیوال میں مکمل کی۔کالج کی تعلیم بہاولپور، لاہور، سری نگر اور جالندھر میں پائی۔بی اے کے آخری سال میں تھے کہ پاکستان قائم ہوا۔تکمیلِ تعلیم کے بعد انڈین نیوی میں ملازمت اختیار کی لیکن راس نہ آئی تو چھوڑ دی۔شاعری بچپن سے کرتے آرہے ہیں۔اُن کا اپنا ایک منفرد اسلوب اور ذاتی لہجہ ہے۔اُردو اور پنجابی میں شعر کہتے ہیں۔اُردو شاعری کے مجموعے یہ ہیں "اُس بے وفا کا شہر، تیز ہوا اور تنہا پھول، جنگل میں دھنک، دشمنوں کے درمیان، شام، ماہِ منیر، چھ رنگین دروازے، کلیاتِ منیر (سات مجموعوں کا مجموعہ)۔پنجابی شاعری کے مجموعے "سفر دی رات، چار چپ چیزاں، رستہ دسن والے ستارے، ساعت سیار" ہیں۔

مُنیر نیازی کی شاعری کی سب سے بڑی خوبصورتی یہ ہے کہ اُن کی شاعری کا ایک ایک شعر ایک ایک مصرعہ اور ایک ایک لفظ پڑھنے والے کے ذہن کے پردے سے ٹکرا کر اُس کی سماعتوں میں عجب طلسم پیدا کر کے قوتِ سامعہ پر ایک گہرا نقش چھوڑ جاتا ہے۔مثلاً اُن کی یہ غزل ملاحظہ ہو

آ گئی یاد

آ گئی یاد شام ڈھلتے ہی
بجھ گیا دل چراغ جلتے ہی
کُھل گئے شہرِ غم کے دروازے
اِک ذرا سی ہوا کے چلتے ہی
کون تھا تُو! کہ پھر نہ دیکھا تجھے
مِٹ گیا خواب آنکھ ملتے ہی

مُنیر نیازی کی شاعری میں اُن کا سب سے بڑا کمال اُن کی اختصار پسندی ہے۔مُنیر نیازی اپنی شاعری میں لفظوں کا استعمال اِس طرح کیا کرتے کہ جیسے بات کی اور ختم بھی کردی۔

اُردو شاعری کے علاوہ مُنیر نیازی نے پنجابی زبان کو بھی اپنی شاعری کے رنگ سے منور کر دیا کہ اُن کی پنجابی شاعری ہر خاص و عام کی زبان بن گئی۔جیسے کہ اُن کا مشہور پنجابی قطعہ

کُج اونج وی راہواں اوکھیاں سن
کُج گل وِچ غم دا طوق وی سی
کُج شہر دے لوکی وی ظالم سن
کُج سانوں مَرن دا شوق وی سی

اشفاق احمد اپنے ایک مضمون میں مُنیر نیازی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''مُنیر کی شاعری میں بہت خوبیاں تھیں اور ایک خرابی بھی، وہ نہ تو جمہور کا شاعر ہے نہ عوام کا، نہ قصیدہ گو ہے اور نہ سرکاری شاعر، نہ مصورِ فطرت ہے نہ شاعرِ انقلاب۔وہ تو بس شاعر ہے، خالی شاعر اور اِس کے سوا کچھ بھی نہیں۔ایسے شاعروں کی بابت ہم نے پرانے قصوں میں کئی باتیں پڑھی تھیں۔ابتدائی انگریزی افسانوں میں انھیں تاریک تہہ خانوں میں اپنی سانسوں کے چراغ جلاتے دیکھا ہے۔''

قیامِ پاکستان کے بعد شعراء میں مُنیر نیازی کی شاعری کا منفرد انداز اور انفرادیت انہیں سب سے ممتاز کرتی ہے۔اُنہوں نے فرد کے باطن کی گہرائی میں اُتر کر فکر کے ایسے موتی دریافت کئے جن کی چمک دمک دوسروں سے جداتھی اور شاعری کا ایسا انداز اپنایا کہ جو ایوانِ شاعری میں نئے نئے موڑ کی اطلاع دیتا دِکھائی دیتا ہے۔مُنیر نیازی کی غزل میں حیرت اور مستی کی ملی جُلی کیفیات نظر آتی ہیں۔ان کے ہاں ماضی کے گمشدہ منظر اور رشتوں کے انحراف کا دُکھ نمایاں ہے۔

مُنیر نیازی کی شاعری کے بارے میں ڈاکٹر محمد افتخار شفیع اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ ''مُنیر نیازی بیسویں صدی کی اُردو شاعری کی اہم ترین آواز ہیں۔اُن کا شعری لب ولہجہ اپنی انفرادیت کے ساتھ ہمیشہ انھیں نمایاں مقام عطا کرے گا۔'' وقت نے ثابت کیا کہ ڈاکٹر محمد افتخار شفیع کی کہی بات سچ ثابت ہوگئی۔

آج مُنیر نیازی ہم میں نہیں لیکن اُن کی شاعری سننے والوں کی روح کو تازہ دم کردیتی ہے۔ مُنیر نیازی کو 2005ء میں ستارۂ امتیاز کا اعزاز حاصل ہوا اور 1992ء میں تمغۂ حُسنِ کارکردگی سے بھی نوازا گیا۔

شیخ ایاز

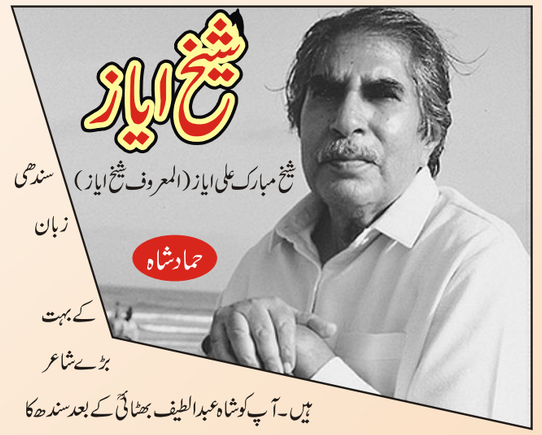

حماد شاہ

شیخ مبارک علی ایاز (المعروف شیخ ایاز) سندھی زبان کے بہت بڑے شاعر ہیں۔ آپ کو شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے بعد سندھ کا عظیم شاعر مانا جاتا ہے۔ اگر آپ کو جدید سندھی ادب کے بانیوں میں شمار کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ آپ مزاحمتی اور ترقی پسند شاعر کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ آپ کی پیدائش 23 مارچ، 1923ء میں شکارپور میں ہوئی۔ آپ نے درجنوں کتابیں لکھیں اور سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے۔ آپ نے "شاہ جو رسالو " کا اُردو میں منظوم ترجمہ کیا جو اُردو ادب میں سندھی ادب کا نیا قدم سمجھا جاتا ہے۔ 23 مارچ، 1994ء کو آپ کو ملک سب سے بڑا ادبی ایوارڈ ہلال امتیاز، 16 اکتوبر 1994ء کو فیض احمد فیضؔ ایوارڈ ملا۔

آپ کی مشہور شاعری درج ذیل ہے:

نیل کنٹھ اور نیم کے پتے (اُردو)

وجوں وسن آئیوں (سندھی)

کپر تھو کن کری

پتن تھو پور کر

چنڈ چنبیلی ول

لڑیو سج لکن میں

الوداعی گیت

کی جی بیجل بولیو

جو بیجل نے اکھیا

نثر

سفید وحشی (سندھی کہانیاں)

جی کاک ککوریا کاپری (سندھی میں خط)

جگ مڑوئی سپنو (سوانح عمری)

ساہیوال جی ڈائری

جب کسی شاعر کا کلام عام لوگوں کی زبان بن جائے تو وہ گیت وہاں اُس قوم کی شعوری آبیاری کرتے ہیں۔ شیخ ایاز کے گیت، نظمیں اور غزل محض شاعری نہیں بلکہ تمام عالم کے مظلوم طبقات کی آواز ہے جس میں اُن کے اپنے رت جگے بھی شامل ہیں۔ شیخ ایاز کی شاعری کی جتنی بھی کتابیں شائع ہوئیں اُن پر نظرِ ثانی کے فرائض سندھ کے نامور دانشور اور ماہرِ تعلیم محمد ابراہیم جویو کے سپرد تھے۔ انہیں اپنی مادری زبان میں تاریخی اور شاہکار اشعار لکھنے کے لیے بھی محمد ابراہیم جویو نے ہی آمادہ کیا تھا۔ اُن کی کتاب ''وجون وسن آئیوں'' کے ابتدائیے میں محمد ابراہیم جویو لکھتے ہیں کہ

''قومیں جب خود کو پہچاننا اور سمجھنا چاہتی ہیں تب سب سے پہلے وہ اپنی زبان کو جانتی اور سمجھتی ہیں کیونکہ زبان ہی اُن کی شناخت کا حقیقی نشان ہے۔ ہر قوم کی اپنی پہلی زبان ہوتی ہے۔ اُدھار میں لی گئی زبان یا ملی جلی زبان پر چلنے والی قوم کی زندگی بھی کھوکھلی ہوتی ہے۔ زبان جتنی خالص ہو اُس قوم کے لیے خود کو پہچاننا آسان ہو جاتا ہے۔''

نامور دانشور رسول بخش بلیچو لکھتے ہیں کہ ''شیخ ایاز کی شاعری کسی فرد کی خالص ذاتی کرامت نہیں۔ یہ سندھ بلکہ دنیا کے اندر شعر کی صدیوں کی ارتقاء کی خاص منزل کا ایک خوبصورت اور شاندار نشان ہے۔''

شیخ ایاز کا سندھی زبان میں ایک اور بہترین کام یہ بھی رہا کہ انہوں نے منظوم ڈرامے بھی تخلیق کیے جن میں ''رنی کوٹ جا دھاڑیل''، ''بھگت سنگھ کھے پھاسی'' اور ''کے جو بیجل بولیو'' جیسے منظوم ڈرامے شامل ہیں۔

''سندھ صدیوں سے''

(ایک سندھی نظم)

رہنے والا ہوں رفیقو

اُس دیارِ درد کا

جس کے صدیوں سے علمبردار سب مارے گئے

سوہنی دھرتی پہ سب وارے گئے

کچھ مورّخ آج پھر تہہ خانۂ تاریخ میں

جھانکتے ہیں

خاک اُس کی پھانکتے ہیں

جا کے پرچم ٹانکتے ہیں

بال سر کے نوچتے ہیں

اور پھر یہ سوچتے ہیں

پرچموں سے خون کے دھبے مٹانے چاہئیں

صاف ستھرے پرچموں کے واسطے

کچھ بہانے چاہئیں!

شیخ ایاز کا انتقال حرکتِ قلب بند ہونے سے 28 دسمبر 1997ء کو کراچی میں ہوا۔ آپ کو شاہ عبداللطیفؒ کی مزار کے ساتھ بھٹ شاہ میں سپردِ خاک کیا گیا۔

پروین شاکر

آمنہ عبیر

پروین شاکر کا اصل نام پروین تھا۔ والد کا نام شاکر حسین۔ قلمی نام پروین شاکر۔ 24 نومبر 1942ء کو لاہور میں پیدا ہوئیں۔ آبائی قصبہ حسین آباد، ضلع گیا، صوبہ بہار۔ رضویہ گرلز کالج کراچی سے بی اے کی سند لی۔ 1972ء میں جامعہ کراچی سے ایم اے انگریزی (ادبیات) اور پھر 1980ء میں دوسرا ایم اے (لسانیات) پاس کیا۔ تکمیلِ تعلیم کے بعد عبداللہ گرلز کالج کراچی میں لیکچرر مقرر ہوئیں۔ ہارورڈ یونیورسٹی امریکہ سے ایم پی اے کا کورس مکمل کیا۔ محکمہ کسٹم میں ملازمت کی۔ وہاں سے اُن کا تبادلہ سنٹرل بورڈ آف ریونیو اسلام آباد ہو گیا۔ وہیں 26 دسمبر 1994ء کو ایک حادثے میں شہید ہوئیں۔

اپنے نئے آہنگ، طرزِ ادا اور نئی سوچ کے باعث عصرِ حاضر کی ممتاز شاعرہ تھیں۔ آپ کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ مشرق و مغرب کی ادب اور عمرانی تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ پی ایچ ڈی کے مقالہ پر کام کر رہی تھیں لیکن زندگی نے وفا نہ کی اور یہ مقالہ مکمل نہ ہو سکا۔

آپ کی شاعری کے چار مجموعے یادگار ہیں، "خوشبو، صد برگ، خود کلامی، انکار۔ پروین شاکر نے شاعری میں اصلاح کے لیے احمد ندیم قاسمی صاحب سے رہنمائی حاصل کی۔

آپ کا بیشتر کلام اُن کے رسالے ''فنون'' میں شائع ہوتا رہا۔ پروین شاکر کی پوری شاعری اُن کے اپنے جذبات و احساسات کی ترجمان ہے جو دنیا کے درد کی بھی ترجمانی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں دورِ جدید کی شاعرات میں خاص مقام حاصل رہا۔ انہوں نے اپنی ہم عصر شاعرات میں کشور ناہید، پروین فنا سید اور فہمیدہ ریاض کی شاعری کی ہمیشہ تعریف کی۔ اُن کے پہلے مجموعے ''خوشبو'' میں ایک نوجوان دوشیزہ کے شوخ و شنگ جذبات کا اظہار ہے جو اُن کے بعد کی شاعری میں جگہ جگہ ملتا ہے۔ ماں کے جذبات، شوہر سے ناچاقی اور علیحدگی، ورکنگ وومن کی مسائل، اِن سب معاشرتی مسائل کو انہوں نے بہت خوبصورتی سے قلم بند کیا ہے۔

یاد کیا آئیں گے وہ لوگ جو آئے نہ گئے

کیا پذیرائی ہو اُن کی جو بلائے نہ گئے

رات بھر میں نے کُھلی آنکھوں سے سپنا دیکھا

رنگ وہ پھیلے کہ نیندوں سے چُرائے نہ گئے

پروین شاکر کی زندگی بے شک دُکھ، درد و آلام میں گزری لیکن اُن کی حوصلہ مندی نے زندگی کی مشکلات کو ہنس کر سامنا کرنے اور ڈٹ کر مقابلہ کرنے کا وہ جذبہ پیدا کیا جہاں مشکل، مشکل نہیں رہتی بلکہ زندگی میں آسانیوں کے در خود بخود وَا ہو جاتے ہیں۔ شاید ایسے ہی حالات کے پیشِ نظر ہمارے شعراء کرام نے ایسے اشعار قلم بند کئے جو انسانی حیات کے پوشیدہ جذبات کی منہ بولتی تصویر ثابت ہوئے۔ پروین شاکر کی زندگی بھی شاید ایسے ہی کسی شعر کا عکس تھی۔ مرزا غالبؔ نے کیا خوب کہا تھا

رنج سے خُوگر ہوا انسان تو مِٹ جاتا ہے رنج

مشکلیں مجھ پہ پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

زندگی جب دُکھ میں سکھ کی صورت اختیار کر لے تو سمجھو وہ کسی سایہ دار درخت کے سائے میں سو رہی ہے۔ پروین شاکر کی شاعری میں رنگِ غزل اُن کے کلام کی انفرادیت کو اور بھی نکھار دیتا ہے۔ خود سے باتیں کرنا اور خود کو سننا پروین شاکر کی شخصیت کی ایک دُکھ بھری سچائی تھی۔ کیا خوبصورت کلام ہے۔ کہتی ہیں:

کتنی دیر تک

املتاس کے پیڑ کے نیچے

بیٹھ کے ہم نے باتیں کیں

کچھ یاد نہیں

بس اتنا اندازہ ہے

چاند ہماری پُشت سے ہو کر

آنکھوں تک آ پہنچا تھا

پروین شاکر آج ہم میں نہیں لیکن اُن کی شاعری آج بھی لاکھوں لوگوں کے دِلوں کی دھڑکن ہے۔

ہم عکس عکس بکھرتے رہے اِسی دُھن میں

کہ زندگی میں کبھی لازوال تھے ہم بھی

شہر سے کوئی ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر پر فضا باغوں اور پھلواریوں میں گھری ہوئی قریب قریب ایک ہی وضع کی بنی ہوئی عمارتوں کا ایک سلسلہ ہے جو دُور تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ عمارتوں میں کئی چھوٹے بڑے دفتر ہیں جن میں کم وبیش چار ہزار آدمی کام کرتے ہیں۔ دن کے وقت اِس علاقے کی چہل پہل اور گہما گہمی عموماً کمروں کی چار دیواریوں ہی میں محدود رہتی ہے۔ مگر صبح کو ساڑھے دس بجے سے پہلے اور سہ پہر کو ساڑھے چار بجے کے بعد وہ سیدھی اور چوڑی چکلی سڑک جو شہر کے بڑے دروازے سے اِس علاقے تک جاتی ہے، ایک ایسے دریا کا روپ دھار لیتی ہے جو پہاڑوں پر سے آیا ہو اور اپنے ساتھ بہت سا خس وخاشاک بہا لایا ہو۔

گرمی کا زمانہ، سہ پہر کا وقت، سڑکوں پر درختوں کے سائے لمبے ہونے شروع ہو گئے تھے مگر ابھی تک زمین کی تپش کا یہ حال تھا کہ جوتوں کے اندر تلوے جھلسے جاتے تھے۔ ابھی ابھی ایک چھڑکاؤ گاڑی گزری تھی۔ سڑک پر جہاں جہاں پانی پڑا تھا بخارات اُٹھ رہے تھے۔

شریف حسین کلرک درجہ دوم، معمول سے کچھ سویرے دفتر سے نکلا اور اُس بڑے پھاٹک کے باہر آ کر کھڑا ہو گیا جہاں سے تانگے والے شہر کی سواریاں لے جایا کرتے تھے۔

گھر لوٹتے ہوئے آدھے راستے تک تانگے میں سوار ہو کر جانا ایک ایسا لطف تھا جو اسے مہینے کے شروع کے صرف چار پانچ روز ہی ملا کرتا تھا اور آج کا دن بھی اُنہی مبارک دنوں میں سے ایک تھا۔ آج خلافِ معمول تنخواہ کے آٹھ روز بعد اُس کی جیب میں پانچ روپے کا نوٹ اور کچھ آنے پیسے پڑے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ اُس کی بیوی مہینے کے شروع ہی میں بچوں کو لے کر میکے چلی گئی تھی اور گھر میں وہ اکیلا رہ گیا تھا۔ دن میں دفتر کے حلوائی سے دو چار پوریاں لے کر کھا لی تھیں اور اوپر سے پانی پی کر پیٹ بھر لیا تھا۔ رات کو شہر کے کسی سستے سے ہوٹل میں جانے کی ٹھانی تھی۔ بس بے فکری ہی بے فکری تھی۔ گھر میں کچھ ایسا اثاثہ تھا نہیں جس کی رکھوالی کرنی پڑتی۔ اِس لیے وہ آزاد تھا کہ جب چاہے گھر جائے اور چاہے تو ساری رات سڑکوں پر گھومتا رہے۔

تھوڑی دیر میں دفتروں سے کلرکوں کی ٹولیاں نکلنی شروع ہوئیں اور اُن میں ٹائپسٹ، ریکارڈ کیپر، ڈسپیچر، اکاؤنٹنٹ، ہیڈ کلرک، سپرنٹنڈنٹ غرض ادنیٰ و اعلیٰ ہر درجہ اور حیثیت کے کلرک تھے اور اسی لحاظ سے اُن کی وضع قطع بھی ایک دوسرے سے جدا تھی۔ مگر بعض ٹائپ خاص طور پر نمایاں تھے۔ سائیکل سوار آدھی آستینوں کی قمیص، خاکی زین کے نیکر اور چپل پہنے، سر پر سولا ہیٹ رکھے، کلائی پر گھڑی باندھے، رنگدار چشمہ لگائے، بڑی بڑی توندوں والے بابو چھاتا کھولے، منہ میں بیڑی، بغلوں میں فائلوں کے گٹھے دبائے۔ اُن فائلوں کو وہ قریب قریب ہر روز اِس اُمید میں ساتھ لے جاتے کہ جو گتھیاں وہ دفتر کے غل غپاڑے میں نہیں سلجھا سکے۔ ممکن ہے گھر کی یکسوئی میں اُن کا کوئی حل سوجھ جائے مگر گھر پہنچتے ہی وہ گرہستی کاموں میں ایسے الجھ جاتے کہ انہیں دیکھنے تک کا موقع نہ ملتا اور اگلے روز انہیں یہ مفت کا بوجھ جوں کا توں واپس لے آنا پڑتا۔

بعض منچلے تانگے، سائیکل اور چھاتے سے بے نیاز، ٹوپی ہاتھ میں، کوٹ کاندھے پر، گریبان کھلا ہوا جسے بٹن ٹوٹ جانے پر انہوں نے سیفٹی پن سے بند کرنے کی کوشش کی تھی اور جس کے نیچے سے چھاتی کے گھنے بال پسینے میں تتر بتر نظر آتے تھے۔ نئے رنگروٹ سستے، سلے سلائے ڈھیلے ڈھالے بدقطع سوٹ پہنے اِس گرمی کے عالم میں

واسکٹ اور نکٹائی کالر تک سے لیس، کوٹ کی بالائی جیب میں دو دو تین تین فونٹین پن اور پنسلیں لگائے خراماں خراماں چلے آ رہے تھے۔

گو اُن میں سے زیادہ تر کلرکوں کی مادری زبان ایک ہی تھی مگر وہ لہجہ بگاڑ بگاڑ کر غیر زبان میں باتیں کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اِس کی وجہ وہ طمانیت نہ تھی جو کسی غیر زبان پر قدرت حاصل ہونے پر اِس میں باتیں کرنے پر اُکساتی ہے بلکہ یہ کہ انہیں دفتر میں دن بھر اپنے افسروں سے اِسی غیر زبان میں بولنا پڑتا تھا اور اِس وقت وہ باہم بات چیت کر کے اِس کی مشق بہم پہنچا رہے تھے۔

ان کلرکوں میں ہر عمر کے لوگ تھے۔ ایسے کم عمر بھولے بھالے ناتجربہ کار بھی جن کی ابھی مسیں بھی پوری نہیں بھیگی تھیں اور جنہیں ابھی سکول سے نکلے تین مہینے بھی نہیں ہوئے تھے اور ایسے عمر رسیدہ، جہاں دیدہ گھاگ بھی جن کی ناک پر سالہا سال عینک کے استعمال کے باعث گہرا نشان پڑ گیا تھا اور جنہیں اِس سڑک کے اُتار چڑھاؤ دیکھتے دیکھتے پچیس پچیس، تیس تیس برس ہو چکے تھے۔ بیشتر کا رکنوں کی پیٹھ میں گدی میں ذرا نیچے خم سا آ گیا تھا اور کندا ستروں سے متواتر داڑھی مونڈھتے رہنے کے باعث اُن کے گالوں اور ٹھوڑی پر بالوں میں جڑیں پھوٹ نکلی تھیں جنہوں نے بے شمار ننھی پھنسیوں کی شکل اختیار کر لی تھی۔

پیدل چلنے والوں میں بہتیرے لوگ بخوبی جانتے تھے کہ دفتر سے اُن کے گھر کو جتنے راستے جاتے ہیں اُن کا فاصلہ کتنے ہزار قدم ہے۔ ہر شخص افسروں کے چڑچڑے پن یا ماتحتوں کی نالائقی پر نالاں نظر آتا تھا۔

ایک تانگے کی سواریوں میں ایک کی کمی دیکھ کر شریف حسین لپک کر اُس میں سوار ہو گیا۔ تانگہ چلا اور تھوڑی دیر میں شہر کے دروازے کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ شریف حسین نے اکنی نکال کر کوچوان کو دی اور گھر کے بجائے شہر کی جامع مسجد کی طرف چل پڑا جس کی سیڑھیوں کے گرداگرد ہر روز شام کو کہنہ فروشوں اور سستا مال بیچنے والوں کی دکانیں سجا کرتی تھیں اور میلہ سا لگا کرتا تھا۔ دنیا بھر کی چیزیں اور ہر وضع اور ہر قماش کے لوگ یہاں ملتے تھے۔ اگر مقصد خرید وفروخت نہ ہو تو بھی یہاں اور لوگوں کو چیزیں خریدتے، مول تول کرتے دیکھنا بجائے خود ایک پُر لطف تماشا تھا۔

شریف حسین لیکچر باز حکیموں، سیناسیوں، تعویذ گنڈے بیچنے والے سیانوں اور کھڑے کھڑے تصویر اُتار دینے والے فوٹو گرافروں کے جمگھٹوں کے پاس ایک ایک دو دو منٹ رُکتا، سیر دیکھتا اُس طرف جا نکلا جہاں کباڑیوں کی دکانیں تھیں۔ یہاں اسے مختلف قسم کی بے شمار چیزیں نظر آئیں۔ اُن میں سے بعض ایسی تھیں جو اپنی اصلی حالت میں بلاشبہ صنعت کا اعلیٰ نمونہ ہوں گی مگر اُن کباڑیوں کے ہاتھ پڑتے پڑتے یا تو اُن کی صورت اِس قدر مسخ ہو گئی تھی کہ پہچانی ہی نہ جاتی تھی یا اُن کا کوئی حصہ ٹوٹ پھوٹ گیا ہوتا جس سے وہ بے کار ہو گئی تھیں۔ چینی کے ظروف اور گلدان، ٹیبل لیمپ، گھڑیاں، جلی ہوئی بیٹریاں، چوکھٹے، گراموفون کے گُل پرزے، جراحی کے آلات، ستار، بھس بھرا ہرن، پیتل کے لمپ ڈھینگ، بدھ کا نیم قد مجسمہ۔۔۔

ایک دکان پر اُس کی نظر سنگِ مرمر کے ایک ٹکڑے پر پڑی جو معلوم ہوتا تھا کہ مغل بادشاہوں کے کسی مقبرے یا بارہ دری سے اُکھاڑا گیا ہے۔ اُس کا طول کوئی سوا فٹ تھا اور عرض ایک فٹ۔ شریف حسین نے اُس ٹکڑے کو اُٹھا کر دیکھا۔ یہ ٹکڑا ایسی نفاست سے تراشا گیا تھا کہ اُس نے محض یہ دیکھنے کے لیے بھلا کباڑی اِس کے کیا دام بتائے گا، قیمت دریافت کی۔

تین روپے! کباڑی نے اُس کے دام کچھ زیادہ نہیں بتائے تھے مگر آخر اسے اِس کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اُس نے ٹکڑا رکھ دیا اور چلنے لگا۔

کیوں حضرت چل دیے؟ آپ بتائیے کیا دیجئے گا!۔

وہ رک گیا۔ اسے یہ ظاہر کرتے ہوئے شرم سی آئی کہ اسے اِس چیز کی ضرورت نہ تھی اور اِس نے محض اپنے شوقِ تحقیق کو پورا کرنے کے لیے قیمت پوچھی تھی۔ اُس نے سوچا، دام اِس قدر کم بتاؤں کہ جو کباڑی کو منظور نہ ہوں۔ کم از کم وہ اپنے دل میں یہ تو نہ کہے کہ یہ کوئی کنگلا ہے جو دکانداروں کا وقت ضائع اور اپنی حرص پوری کرنے آیا ہے۔

ہم تو ایک روپیہ دیں گے۔ یہ کہہ کر شریف حسین نے چاہا کہ جلد جلد قدم اٹھاتا ہوا کباڑی کی نظروں سے اوجھل ہو جائے مگر اُس نے اِس کی مہلت ہی نہ دی۔

اجی سنیے تو، کچھ زیادہ نہیں دیں گے؟ سوا روپیہ بھی نہیں؟ .. اچھا لے جائیے۔

شریف حسین کو اپنے آپ پر غصہ آیا کہ مَیں نے بارہ آنے کیوں نہ کہے۔ اب لوٹنے کے سوا کوئی چارہ ہی کیا تھا۔ قیمت ادا کرنے سے پہلے اُس نے اِس مرمریں ٹکڑے کو اٹھا کر دوبارہ دیکھا بھالا کہ اگر ذرا سا بھی نقص نظر آئے تو اِس سودے کو منسوخ کر دے۔ مگر وہ ٹکڑا بے عیب تھا۔ نہ جانے کباڑی نے اسے اِس قدر سستا کیوں بیچنا قبول کیا تھا۔

رات کو جب وہ کھلے آسمان کے نیچے اپنے گھر کی چھت پر اکیلا بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا تو اُس سنگِ مرمر کے ٹکڑے کا ایک مصرف اُس کے ذہن میں آیا۔ خدا کے کارخانے عجیب ہیں۔ وہ بڑا غفور الرحیم ہے۔ کیا عجب اُس کے دن پھر جائیں۔ وہ کلرک درجہ دوم سے ترقی کر کے سپرنٹنڈنٹ بن جائے اور اُس کی تنخواہ چالیس سے بڑھ کر چار سو ہو جائے۔ یہ نہیں تو کم سے کم ہیڈ کلرک ہی سہی۔ پھر اسے ساجھے کے مکان میں رہنے کی ضرورت نہ رہے بلکہ وہ کوئی چھوٹا سا مکان لے لے اور اِس مرمریں ٹکڑے پر اپنا نام کندہ کرا کے دروازے کے باہر نصب کر دے۔

مستقبل کی یہ خیالی تصویر اُس کے ذہن پر کچھ اِس طرح چھا گئی کہ یاں تو وہ اِس مرمریں ٹکڑے کو بالکل بے مصرف سمجھتا تھا یاں اب اسے ایسا محسوس ہونے لگا گویا وہ ایک عرصے سے اِس قسم کے ٹکڑے کی تلاش میں تھا اور اگر اسے نہ خریدتا تو بڑی بھول ہوتی۔

شروع شروع میں جب وہ ملازم ہوا تھا تو اُس کا کام کرنے کو جوش اور ترقی کا ولولہ انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ مگر دو سال کی سعی لاحاصل کے بعد رفتہ رفتہ اُس کا یہ جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور

مزاج میں سکون آ چلا تھا۔ مگر سنگِ مرمر کے ٹکڑے نے پھر اُس کے خیالوں میں ہلچل ڈال دی۔ مستقبل کے متعلق طرح طرح کے خوش آئندہ خیالات ہر روز اُس کے دماغ میں چکر لگانے لگے۔ اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، دفتر جاتے، دفتر سے آتے، کوٹھیوں کے باہر لوگوں کے نام کے بورڈ دیکھ کر۔ یہاں تک کہ جب مہینہ ختم ہوا اور اسے تنخواہ ملی تو اُس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ سنگِ مرمر کے ٹکڑے کو شہر کے ایک مشہور سنگ تراش کے پاس لے گیا جس نے بہت چابکدستی سے اُس پر اُس کا نام کندہ کر کے کونوں میں چھوٹی چھوٹی خوشنما بیلیں بنا دیں۔

اُس سنگِ مرمر کے ٹکڑے پر اپنا نام کھدا ہوا دیکھ کر اسے ایک عجیب سی خوشی ہوئی۔ زندگی میں شاید یہ پہلا موقع تھا کہ اُس نے اپنا نام اِس قدر جلی حروف میں لکھا ہوا دیکھا ہو۔

سنگ تراش کی دکان سے روانہ ہوا تو بازار میں کئی مرتبہ اُس کا جی چاہا کہ کتبہ پر سے اُس اخبار کو اُتار ڈالے جس میں سنگ تراش نے اسے لپیٹ دیا تھا اور اُس پر ایک نظر اور ڈال لے مگر ہر بار ایک نامعلوم حجاب جیسے اُس کے ہاتھ پکڑ لیتا۔ شاید وہ راہ چلتوں کی نگاہوں سے ڈرتا کہ کہیں وہ اِس کتبہ کو دیکھ کر اُس کے اُن خیالات کو نہ بھانپ جائیں جو پچھلے کئی دنوں سے دماغ پر مسلط تھے۔

گھر کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی اُس نے اخبار اُتار پھینکا اور نظریں کتبہ کی دلکش تحریر پر گاڑے دھیرے دھیرے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ بالائی منزل میں اپنے مکان کے دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ جیب سے چابی نکالی، قفل کھولنے لگا۔ پچھلے دو برس میں آج پہلی مرتبہ اُس پر یہ انکشاف ہوا کہ اُس کے مکان کے باہر ایسی کوئی جگہ ہی نہیں کہ اُس پر کوئی بورڈ لگایا جا سکے۔ اگر جگہ ہوتی بھی تو اِس قسم کے کتبے وہاں تھوڑا ہی لگائے جاتے ہیں۔ اِن کے لیے تو بڑا سا مکان چاہیے جس کے پھاٹک کے باہر لگایا جائے تو آتے جاتے کی نظر بھی پڑے۔

قفل کھول کر مکان کے اندر پہنچا اور سوچنے لگا کہ فی الحال اِس کتبہ کو کہاں رکھوں۔ اُس کے ایک حصہ مکان میں دو کوٹھریاں، ایک غسل خانہ اور ایک باورچی خانہ تھا۔ الماری صرف ایک ہی کوٹھڑی میں تھی مگر اُس کے کواڑ نہیں تھے۔ بالآخر اُس نے کتبہ کو اُس بے کواڑ کی الماری میں رکھ دیا۔

ہر روز شام کو جب وہ دفتر سے تھکا ہارا واپس آتا تو سب سے پہلے اُس کی نظر اِس کتبہ ہی پر پڑتی۔ اُمیدیں اسے سبز باغ دکھاتیں اور دفتر کی مشقت کی تکان کسی قدر کم ہو جاتی۔ دفتر میں جب کبھی اُس کا کوئی ساتھی کسی معاملے میں اُس کی رہنمائی کا جویا ہوتا تو اپنی برتری کے احساس سے اُس کی آنکھیں چمک اٹھتیں جب کبھی کسی ساتھی کی ترقی کی خبر سنتا، آرزوئیں اُس کے سینے میں ہیجان پیدا کر دیتیں۔ افسر کی ایک ایک نگاہ لطف و کرم کا نشہ اسے آٹھ آٹھ دن رہتا۔

جب تک اُس کی بیوی بچے نہیں آئے وہ اپنے خیالوں ہی میں مگن رہا۔ نہ دوستوں سے ملنا نہ کھیل تماشوں میں حصہ لیتا، رات کو جلد ہی ہوٹل سے کھانا کھا کر گھر آ جاتا اور سونے سے پہلے گھنٹوں عجیب عجیب خیالی دنیاؤں میں رہتا، مگر اُن کے آنے کی دیر تھی کہ نہ تو وہ فراغت ہی رہی اور نہ وہ سکون ہی ملا۔ ایک بار پھر گرہستی کے فکروں نے اسے ایسا گھیر لیا کہ مستقبل کی یہ سہانی تصویریں رفتہ رفتہ دھندلی پڑ گئیں۔

کتبہ سال بھر تک اسی بے کواڑ کی الماری میں پڑا رہا۔ اِس عرصے میں اُس نے نہایت محنت سے کام کیا۔ اپنے افسروں کو خوش رکھنے کی انتہائی کوشش کی مگر اُس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔

اب اُس کے بیٹے کی عمر چار برس کی ہو گئی تھی اور اُس کا ہاتھ اُس بے کواڑ کی الماری تک بخوبی پہنچ جاتا تھا۔ شریف حسین نے اِس خیال سے کہ کہیں اُس کا بیٹا کتبہ کو گرا نہ دے اسے وہاں سے اُٹھا لیا اور اپنے صندوق میں کپڑوں کے نیچے رکھ دیا۔

ساری سردیاں یہ کتبہ اُس صندوق ہی میں پڑا رہا۔ جب گرمی کا موسم آیا تو اُس کی بیوی کو اس کے صندوق سے فالتو چیزوں کو نکالنا پڑا۔ چنانچہ دوسری چیزوں کے ساتھ بیوی نے کتبہ بھی نکال کر کاٹھ کے اُس پرانے بکس میں ڈال دیا جس میں ٹوٹے ہوئے چوکھٹے، بے بال کے برش، بیکار صابن دانیاں، ٹوٹے ہوئے کھلونے اور ایسی ہی اور دوسری چیزیں پڑی رہتی تھیں۔

شریف حسین نے اپنے مستقبل کے متعلق زیادہ سوچنا شروع کر دیا تھا۔ دفتروں کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر وہ اِس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ ترقی لطیفہ غیبی سے نصیب ہوتی ہے، کڑی محنت جھیلنے اور جان کھپانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اُس کی تنخواہ میں ہر دوسرے برس تین روپے کا اضافہ ہو جاتا جس سے بچوں کی تعلیم وغیرہ کا خرچ نکل آتا اور اسے زیادہ تنگی نہ اٹھانی پڑتی۔ پے در پے مایوسیوں کے بعد جب اُس کو ملازمت کرتے بارہ برس ہو چکے تھے اور اُس کے دل سے رفتہ رفتہ ترقی کے تمام ولولے نکل چکے تھے اور کتبہ کی یاد تک ذہن سے محو ہو چکی تھی تو اُس کے افسروں نے اُس کی دیانت داری اور پرانی کار گزاری کا خیال کر کے اسے تین مہینے کے لیے عارضی طور پر درجہ اول کے ایک کلرک کی جگہ دے دی جو چھٹی پر جانا چاہتا تھا۔

جس روز اسے یہ عہدہ ملا اُس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اُس نے تانگے کا بھی انتظار نہ کیا بلکہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا پیدل ہی بیوی کو یہ مژدہ سنانے چل دیا۔ شاید تانگہ اسے کچھ زیادہ جلدی گھر نہ پہنچا سکتا!

اگلے مہینے اُس نے نیلام گھر سے ایک سستی سی لکھنے کی میز اور ایک گھومنے والی کرسی خریدی۔ میز کے آتے ہی اسے پھر کتبہ کی یاد آئی اور اُس کے ساتھ ہی اُس کی سوئی ہوئی اُمنگیں جاگ اٹھیں۔ اُس نے ڈھونڈ ڈھانڈ کے کاٹھ کی پیٹی میں سے کتبہ نکالا، صابن سے دھویا پونچھا اور دیوار کے سہارے میز پر ٹکا دیا۔

یہ زمانہ اُس کے لیے بہت کٹھن تھا کیونکہ وہ اپنے افسروں کو اپنی برتر کارگزاری دکھانے کے لیے چھٹی پر گئے ہوئے کلرک سے دگنا کام کرتا۔ اپنے ماتحتوں کو خوش رکھنے کے لیے بہت سا اُن کا کام بھی کر دیتا۔ گھر پر آدھی رات تک فائلوں میں غرق رہتا۔ پھر بھی

وہ خوش تھا۔ ہاں جب کبھی اسے اُس کلرک کی واپسی کا خیال آتا تو اُس کے دل بجھ سا جاتا کبھی کبھی وہ سوچتا، ممکن ہے وہ اپنی چھٹی کی میعاد بڑھوا لے۔۔۔! ممکن ہے وہ بیمار پڑ جائے۔۔۔! ممکن ہے وہ کبھی نہ آئے۔۔۔!

مگر جب تین مہینے گزر رہے تو نہ اُس کلرک نے چھٹی کی میعاد ہی بڑھوائی اور نہ بیمار ہی پڑا، البتہ شریف حسین کو اپنی جگہ پر آ جانا پڑا۔

اُس کے بعد جو دن گزرے، وہ اُس کے لیے بڑی مایوسی اور افسردگی کے تھے۔ تھوڑی سی خوشحالی کی جھلک دیکھ لینے کے بعد اب اسے اپنی حالت پہلے سے بھی زیادہ ابتر معلوم ہونے لگی تھی۔ اُس کا جی کام میں مطلق نہ لگتا تھا۔ مزاج میں آلکس اور حرکات میں سستی سی پیدا ہونے لگی، ہر وقت بیزار بیزار سا رہتا۔ نہ کبھی ہنستا، نہ کسی سے بولتا چالتا مگر یہ کیفیت چند دن سے زیادہ نہ رہی۔ افسروں کے تیور جلد ہی اسے راہِ راست پر لے آئے۔

اب اُس کا بڑا لڑکا چھٹی میں پڑھتا تھا اور چھوٹا چوتھی میں اور منجھلی لڑکی ماں سے قرآن مجید پڑھتی، سینا پرونا سیکھتی اور گھر کے کام کاج میں اُس کا ہاتھ بٹاتی۔ باپ کی میز کرسی پر بڑے لڑکے نے قبضہ جما لیا۔ وہاں بیٹھ کر وہ اسکول کا کام کیا کرتا۔ چونکہ میز کے ہلنے سے کتبہ گر جانے کا خدشہ رہتا تھا اور پھر اُس نے میز کی بہت سی جگہ بھی گھیر رکھی تھی۔ اِس لیے اُس لڑکے نے اسے اُٹھا کر پھر اُسی بے کواڑ کی الماری میں رکھ دیا۔

سال پر سال گزرتے گئے۔ اِس عرصہ میں کتبہ نے کئی جگہیں بدلیں، کبھی بے کواڑ کی الماری میں تو کبھی میز پر۔ کبھی صندوقوں کے اوپر تو کبھی چارپائی کے نیچے۔ کبھی بوری میں تو کبھی کاٹھ کے بکس میں۔ ایک دفعہ کسی نے اُٹھا کر باورچی خانے کے اُس بڑے طاق میں رکھ دیا جس میں روزمرہ کے استعمال کے برتن رکھے رہتے تھے۔ شریف حسین کی نظر پڑ گئی، دیکھا تو دھوئیں سے اُس کا سفید رنگ پیلا پڑ جاتا تھا، اُٹھا کر دھویا پونچھا اور پھر بے کواڑ کی الماری میں رکھ دیا مگر چند ہی روز میں اسے پھر غائب کر دیا گیا اور اُس کی جگہ وہاں کاغذی پھولوں کے بڑے بڑے گملے رکھ دیے گئے جو شریف حسین کے بڑے بیٹے کے کسی دوست نے اسے تحفے میں دیے تھے۔ رنگ پیلا پڑ جانے سے کتبہ الماری میں رکھا ہوا بدنما معلوم ہوتا تھا مگر اب کاغذی پھولوں کے سرخ سرخ رنگوں سے الماری میں جیسے جان پڑ گئی تھی اور ساری کوٹھڑی دہک اٹھی تھی۔

اب شریف حسین کو ملازم ہوئے پورے بیس سال گزر چکے تھے۔ اُس کے سر کے بال نصف سے زیادہ سفید ہو چکے تھے اور پیٹھ میں گدی سے ذرا نیچے خم آ گیا تھا۔ اب بھی کبھی کبھی اُس کے دماغ میں خوشحالی و فارغ البالی کے خیالات چکر لگاتے مگر اب اُن کی کیفیت پہلے کی سی نہ تھی کہ خواہ وہ کوئی کام کر رہا ہو۔ تصورات کو اُڑا لے جاتی اور پھر بیٹی کی شادی، لڑکوں کی تعلیم، اُس کے بڑھتے ہوئے اخراجات، پھر ساتھ ہی ساتھ اُن کے لیے نوکریوں کی تلاش۔۔۔! یہ ایسی فکریں نہ تھیں کہ پل بھر کو بھی اِس خیال کو کسی اور طرف بھٹکنے دیتیں۔

پچپن برس کی عمر میں اسے پنشن مل گئی۔ اب اُس کا بیٹا ریل کے مال گودام میں کام کرتا تھا۔ چھوٹا کسی دفتر میں ٹائپسٹ تھا اور اُس سے چھوٹا انٹرنس میں پڑھتا تھا۔ اپنی پنشن اور لڑکوں کی تنخواہیں سب مل ملا کے کوئی ڈیڑھ سو روپے ماہوار کے لگ بھگ آمدنی ہو جاتی تھی جس میں بخوبی گزر ہونے لگی۔ علاوہ ازیں اُس کا ارادہ کوئی چھوٹا موٹا بیوپار شروع کرنے کا بھی تھا مگر مندے کے ڈر سے ابھی پورا نہ ہو سکا تھا۔

اپنی کفایت شعاری اور بیوی کی سلیقہ مندی کی بدولت اُس نے بڑے بیٹے اور بیٹی کی شادیاں خاصی دھوم دھام سے کر دی تھیں۔ اِن ضروری کاموں سے نمٹ کر اُس کے جی میں آئی کہ حج کر آئے مگر اِس کی توفیق نہ ہو سکی۔ البتہ کچھ دنوں مسجدوں کی رونق خوب بڑھائی مگر پھر جلد ہی بڑھاپے کی کمزوریوں اور بیماریوں نے دبانا شروع کر دیا اور زیادہ تر چارپائی ہی پر پڑا رہنے لگا۔

جب اسے پنشن وصول کرتے تین سال گزر گئے تو جاڑے کی ایک رات کو وہ کسی کام سے بستر سے اُٹھا۔ گرم گرم لحاف سے نکلا تھا۔ پچھلے پہر کی سرد اور تند ہوا تیر کی طرح اُس کے سینے میں لگی اور اسے نمونیا ہو گیا۔ بیٹوں نے اُس کے بہتیرے علاج معالجے کرائے۔ اُس کی بیوی اور بہو دن رات اُس کی پٹی سے لگی بیٹھی رہیں مگر افاقہ نہ ہوا وہ کوئی چار دن بستر پر پڑے رہنے کے بعد مر گیا۔

اُس کی موت کے بعد اُس کا بڑا بیٹا مکان کی صفائی کرا رہا تھا کہ پرانے اسباب کا جائزہ لیتے ہوئے ایک بوری میں اسے یہ کتبہ مل گیا۔ بیٹے کو باپ سے بے حد محبت تھی، کتبہ پر باپ کا نام دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آئے اور وہ دیر تک ایک محویت کے عالم میں اُس کی خطاطی اور نقش و نگار کو دیکھتا رہا۔ اچانک اسے ایک بات سوجھی جس نے اُس کی آنکھوں میں چمک پیدا کر دی۔

اگلے روز وہ کتبہ کو ایک سنگ تراش کے پاس لے گیا اور اُس سے کتبہ کی عبارت میں تھوڑی سی ترمیم کرائی اور پھر اُسی شام اسے اپنے باپ کی قبر پر نصب کر دیا۔

صدائے عالم

دسمبر 2024 کومنائے جانے والے عالمی دن

ایڈز سے آگاہی کا عالمی دن۔۔یکم دسمبر

غلامی کے۔خاتمے کا عالمی دن2 دسمبر

معذوروں کا عالمی دن3 دسمبر

مٹی کا عالمی دن5 دسمبر

کرپشن کی روک تھام کا عالمی دن9 دسمبر

انسانی حقوق کی آگاہی کا عالمی دن10 دسمبر

پہاڑوں کا عالمی دن11 دسمبر

صحت کی سہولتوں کی فراہمی کا عالمی دن 12 دسمبر

نقل مکانی کرنے والوں کا عالمی دن18 دسمبر

انسانوں کے مابین یکجہتی کا عالمی دن 20 دسمبر

وباؤں سے نمٹنے کی تیاری کا عالمی دن27 دسمبر

خوابیدہ بروغل

تحریر: مدحت آصف

ضلعی مراکز سے 280 کلومیٹر کی مسافت پر واقع وادیٔ بروغل کے تیرہ متصل گاؤں تک رسائی صرف ایک کچی سڑک پر جیپ کے ذریعے 90 کلومیٹر کا سفر طے کرنے اور اِس کے بعد دو سے تین دن کے پیدل سفر کے ذریعے ممکن ہے۔ موسم سرما کے لیے ہم وہ اشیا ذخیرہ اور استعمال کرتے ہیں جن میں حراروں کی کثیر مقدار ہو۔

عمر رفیع، جو وادی کا پہلا دسویں پاس نوجوان ہے، کے مطابق کھانے پینے کی ضروری اشیاء میں پنیر، لکھناور، جنگلی باقلوں (لوبیا) کے آٹے سے تیار شدہ روٹی شامل ہے۔ علاوہ ازیں ہر خاندان دو تین یاک اور چربی دار بھیڑیں جنہیں مقامی زبان میں بخنہ کہا جاتا ہے، ذبح کرتے ہیں اور روزانہ کی فہرستِ طعام میں شامل کر لیتے ہیں۔ لشکر گز، گارل، چلمار آباد، اشکرواز، چکار، بچوس، ودین کوٹ، جنگل اور کوئی اِس وادی کے اہم گاؤں ہیں جن میں ہر خاندان اوسطاً سات سے تیس افراد پر مشتمل ہے۔ جبکہ (این جی او) کی شماریات کے مطابق چلمار آباد 321 نفوس کی آبادی کے ساتھ یہاں کا سب سے بڑا گاؤں ہے۔ یاک اور بختے کا گوشت سردی سے بچاؤ میں بہت مددگار ثابت ہوتا ہے اور لوگوں کو شدید کڑکڑاتے موسم میں گرم رہنے میں مدد دیتا ہے۔

شدید موسمی صورتحال کی وجہ سے وادی میں زراعت برائے نام ہے۔ یہاں صرف جنگلی گندم اور آلو کی کچھ قسمیں اُگائی جاسکتی ہیں۔ یہ علاقہ کاشتکاری کے جدید ذرائع سے بے بہرہ ہے اور صرف پہاڑی پگڈنڈیوں، وسیع و عریض گھاس کے میدان اور چراگاہوں پر مشتمل ہے جن کی بلندی سطح سمندر سے 10765 سے 14121 فٹ تک ہے۔ اِس کے علاوہ یہاں پر خوراک کا بیشتر انحصار جنگلی حیات پر ہے جن میں سرِ فہرست یاک ہے مگر اِس کے علاوہ بھیڑ بکریاں اور مویشی بھی پالے جاتے ہیں۔ یہ جانور نہ صرف مقامی باشندوں کی غذائی ضروریات پوری کرتے ہیں بلکہ ایندھن کی فراہمی میں بھی مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ جانوروں کے گوبر سے تیار کردہ اُپلے موسم گرما میں محفوظ کر لیے جاتے ہیں۔

موسم سرما میں وادیٔ بروغل کے باشندوں کی خوراک کے حصول میں مشکلات پہلی مرتبہ 1975ء میں منظرِ عام پر آئی تھیں۔ مقامی لوگوں کی کچھ تعداد نہایت شوق سے وہ وقت یاد کرتی ہے جب اُس وقت کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے اُن کے علاقے میں بذریعہ ہیلی کاپٹر وہاں کے باسیوں اور اُن کے مال مویشیوں کے لیے خوراک کے تھیلے پھینکے۔

بعد ازاں غیر متوقع حادثات سے نمٹنے کے لیے مقامی افراد کی خاطر خوراک ذخیرہ کرنے والے گودام تعمیر کیے گئے جو محکمۂ خوراک کے زیرِ انتظام چلتے ہیں۔ یہاں موسم سرما کے سخت دنوں کی خاطر گندم ذخیرہ کر لی جاتی ہے۔

برف پوش چوٹیوں، منجمند دریاؤں، دلکش جھیلوں اور لہلہاتی چراگاہوں سے مزین وادیٔ بروغل میں بہتری لانے کے بہت مواقع ہیں۔ مثلاً معاشی اور سیاحتی شعبوں کے ذریعے بالخصوص دریائے چترال اور اِس کے معاون دریاؤں سے حاصل ہونے والی آبی توانائی کے ذریعے بھی ایک معاشی انقلاب ممکن ہے مگر ان تمام ترقیاتی کاموں کی راہ میں بنیادی رکاوٹ سڑکوں کے جال کی عدم موجودگی ہے۔ اِن تمام منصوبوں پر عمل تبھی ممکن ہے جب حکومت بروغل کے ترقیاتی عوامل پر توجہ مرکوز کر کے انہیں پھلنے پھولنے کا موقع فراہم کرے گی۔ شاید یہ واحد صورت ہے جس کی بنیاد پر اہلِ بروغل اپنی زندگیوں میں بہتری کی اُمید اور ایک نیک کل کا انتظار کر سکتے ہیں۔

سلیم گیلانی صاحب کے تین کارنامے

تحریر: عظیم سرور

ریڈیو پاکستان سے وابستہ شخصیات میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں جو اپنے اپنے فن میں طاق تھیں جو جینئس تھیں اور جنھوں نے بلاشبہ یادگار کام کیے۔ لیکن ریڈیو پاکستان کے پہلے ڈائریکٹر جنرل جناب ذوالفقار علی بخاری کے بعد جناب سلیم گیلانی ایک ایسی شخصیت تھے جن کو مکمل براڈ کاسٹر کا درجہ حاصل ہے۔ وہ نشریات کے شعبہ کی ایک ہمہ جہت شخصیت تھے۔ وہ تخلیق کار بھی تھے، اختراعات بھی کرتے تھے اور پروگراموں کی نشریات کے بہترین منتظم بھی تھے۔

''میرے بہت سے ساتھی گیلانی صاحب کے بارے میں بہت کچھ لکھیں گے۔ مَیں اِس مضمون میں پاکستان کی براڈ کاسٹنگ میں سلیم گیلانی صاحب کے تین کارناموں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ اُن کا ایک بڑا کارنامہ پاکستان کی ساؤنڈ آرکائیو کا قیام ہے۔ جب اُن کو 1962ء میں ٹرانسکرپشن سروس کا سربراہ بنایا گیا تو اُنھوں نے اِس ادارے میں آوازوں کی ایک لائبریری کے قیام کا فیصلہ کیا۔ اُنھوں نے تمام اسٹیشنوں سے رابطہ کر کے وہاں پر موجود تمام فنکاروں کی ریکارڈنگ کو اِس لائبریری میں محفوظ کرنے کا کام شروع کیا۔ ریڈیو پاکستان کراچی کے اسٹوڈیو B-6 کے پیچھے ایک اسٹوڈیو میں سے ردی کر کے ڈالے گئے Presto Disc Records نکالے گئے۔ اُن کی گرد صاف کی گئی تو خان لیاقت علی خاں کی کئی تقریریں مل گئیں۔ علامہ شبیر احمد عثمانی کی ایک نادر تقریر دستیاب ہوئی۔ بہادر یار جنگ کی تقریر کا ریکارڈ ملا۔ اِس کے علاوہ کئی کلاسیکی فنکاروں کی آوازوں میں راگوں کی ریکارڈنگز مل گئیں۔ کئی ڈرامے اور یادگار پروگرام ملے۔ گیلانی صاحب نے اپنی ٹیم میں جناب مجید فاروقی جیسی شخصیات کے تعاون سے اِس لائبریری کے کئی شعبے بنائے۔ اِس میں تحریکِ پاکستان کی نادر شخصیات کی آواز میں جدوجہدِ آزادی کی کہانیاں ریکارڈ ہوئیں۔ فنکاروں کے فن پارے اور اُن کے انٹرویوز محفوظ کیے گئے۔ ریڈیو کے یادگار ڈرامے اور ملک میں ہونے والے اہم مشاعرے بھی اِس لائبریری کی زینت بنے۔

پھر ملک بھر کے کلاسیکی، لوک اور ہلکی پھلکی موسیقی کے تقریباً تمام فنکاروں کے آئٹم محفوظ کیے گئے۔ تمام بڑے افسانہ نگاروں کے اہم افسانے اُن کی آوازوں میں ریکارڈ ہوئے۔ اِس کے علاوہ اہم کارنامہ تھیٹر کی تاریخی موسیقی کو ''تھیٹر کے نغمے'' کے عنوان سے محفوظ کر کے انجام دیا گیا۔ مسلمان ڈرامہ نگاروں، نغمہ نگاروں اور موسیقاروں کے تمام فن پاروں کو از سرِ نو ریکارڈ کر کے پاکستان کے ثقافتی خزانے کی قدر و قیمت میں اضافہ کیا گیا۔ ٹرانسکرپشن سروس میں موجود ریکارڈنگ پاکستان کی ثقافتی تاریخ کا ایک انمول ورثہ ہے جس پر ہم فخر کر سکتے ہیں۔

سلیم گیلانی صاحب کا دوسرا بڑا کارنامہ موسیقی کی صنف میں پاکستانی غزل کو روشناس کرانا ہے۔ ہماری موسیقی کی روایت بہت جان دار ہے۔ اِس میں خیال، راگ، قوالی، ٹھمری اور دادرا کے ساتھ غزل کی گائیکی نے بھی رواج پایا لیکن غزل کی گائیکی راگ اور خیال یا لوک رنگ کے تابع ہوتی تھی۔ غزل کی گائیکی میں کئی رنگ تھے۔ مجرا رنگ تھا، قوالی رنگ تھا، ٹھمری کا انداز تھا، گیت رنگ تھا اور لوک رنگ میں بھی غزل گائی جاتی تھی۔ غزل گانے والے بڑے بڑے فنکار گزرے لیکن غزل کی ایک دُھن بنانے کے بعد وہ غزل کے ہر شعر کو اِس دُھن کے تابع کر دینے پر مجبور ہوتے تھے جس کے نتیجے میں غزل کی معنویت اور روح پوری طرح اُجاگر نہ ہو سکتی تھی۔ ٹرانسکرپشن سروس میں گیلانی صاحب نے موسیقی کے شعبے کو مضبوط کیا۔ اُستاد ٹھو خاں اور پنڈت غلام قادر (مہدی حسن کے بڑے بھائی) کو کمپوزر کی حیثیت سے رکھا۔ مہدی حسن کو باقاعدہ فنکار کی حیثیت سے ماہانہ کنٹریکٹ پر ملازمت دی گئی۔ اب گیلانی صاحب نے غزل کی گائیکی کے لیے مہدی حسن کے فن کو استعمال کرنے کا پروگرام بنایا۔ مہدی حسن کلاسیکی موسیقی سے مکمل آشنا، ریاض کے ذریعے آواز بے حد خوب صورت، گلے کے تمام Grooves بولتے اور سب سُر میں تھے۔ مہدی حسن پہلے کراچی اور پھر ایک عرصے سے لاہور کے موسیقی آرٹسٹ تھے اور باقاعدہ

پروگرام کیا کرتے تھے۔ اُستاد برکت علی خاں، علی بخش ظہور، اعجاز حسین حضروی، نہال عبداللہ بھی اُسی زمانے کے فنکار تھے۔ 1962ء میں گیلانی صاحب نے نئی غزل کے منصوبے کے تحت تجربہ کیا۔ مہدی حسن کو بتایا کہ غزل کی دُھن میں لفظوں کو کیسے جگانا ہے، مصرعے کو کیسے معنویت دینی ہے اور شعر کی روح کو کس طرح اُجاگر کرنا ہے۔ پھر غلام قادر خان کی بنائی ہوئی دُھن اور مہدی حسن کی آواز میں جب فیض احمد فیض کی غزل ''گلوں میں رنگ بھرے، بادِ نوبہار چلے'' ریکارڈ ہو کر نشر ہوئی تو پورے ملک میں دھوم مچ گئی۔ اب غزل، موسیقی کے روپ میں زندہ ہو کر سماعتوں کے ذریعے دلوں پر اثر انداز ہونے لگی۔ اِس ایک غزل کے ساتھ ہی مہدی حسن ملک کا اسٹار بن گیا۔ ہندوستان میں یہ غزل پہنچی تو موسیقی کے حلقوں نے اِس انداز کو پاکستانی غزل کا نام دیا اور اِس انداز کے ساتھ مہدی حسن غزل کے تمام فنکاروں میں سب سے بڑا نام بن گیا۔

1965ء کی جنگ سے پہلے جب رن کچھ میں چھیڑ چھاڑ چل رہی تھی تو ریڈیو پاکستان میں کئی قومی نغمے ریکارڈ ہوئے تھے۔ اِس سے پہلے بھی گاہے گاہے قومی نغمے بنائے جاتے تھے لیکن یہ تمام روایتی انداز کے گیت ہوتے تھے۔ وادیوں، کہساروں کی تعریفیں، بڑھے چلو مجاہدو کے نعرے اور دیس کے حُسن وغیرہ کی باتیں ہوتی تھیں۔ اُن گیتوں کو Cliche سے بھرپور گیت کہا جاسکتا تھا۔ 1965ء کی جنگ میں جب خبر آئی کہ پاک افواج نے لاہور پر ہونے والا حملہ مکمل طور پر پسپا کر دیا ہے تو گیلانی صاحب نے اِس واقعے کو زندہ جاوید بنانے کے لیے ایک یادگار گیت پیش کرنے کا ارادہ کیا۔ اُنھوں نے کہا کہ کون لاہور کے اِس واقعے پر گیت فوری لکھ سکتا ہے؟ یہ گیت آج ہی نشر ہونا چاہیے تاکہ لاہور کے شہریوں کی ہمت بڑھائی جائے۔ مجید فاروقی صاحب نے کہا سب سے تیز گیت رئیس امروہوی لکھ سکتے ہیں۔ رئیس صاحب کو فون کیا گیا۔ گیلانی صاحب نے اُن سے بات کی اور کہا کہ لاہور کو سلام پیش کرنا ہے۔ لاہور نے پاکستان کے اسٹالین گراڈ کا کردار ادا کیا ہے۔ رئیس صاحب نے کہا مجھ سے آدھے گھنٹے بعد گیت لے لیجیے گا۔ ٹھیک 30 منٹ بعد گیلانی صاحب نے فون ملایا۔ مَیں کاغذوں میں 5 کاربن پیپر لگا کر سامنے بیٹھا تھا۔ رئیس صاحب سے سن کر گیلانی صاحب نے کہا ''خطۂ لاہور تیرے جاں نثاروں کو سلام'' یہ مصرعہ مَیں نے لکھ لیا تو فون پر سن کر گیلانی صاحب نے کہا ''شہریوں کو، غازیوں کو، شہ سواروں کو سلام'' پورے کمرے میں موجود لوگوں کے منہ سے بے اختیار واہ نکلا۔ گیت مکمل ہوا تو گیلانی صاحب نے مہدی حسن اور اُستاد ٹھوخاں سے کہا کہ جائیے اور اِسے ریکارڈ کر لیجیے۔ اُس کی دُھن بنی، ریہرسل ہوئی، سازینہ بنا اور ریکارڈنگ ہوئی۔ ٹھیک 45 منٹ بعد یہ نغمہ گیلانی صاحب کے کمرے کے ٹیپ ریکارڈ پر بج رہا تھا اور کئی لوگ شدتِ جذبات سے رو رہے تھے۔ اُسی رات یہ نغمہ نشر ہوا اور پھر پورے پاکستان پر اِس نغمے کا رنگ چھا گیا۔

گیلانی صاحب نے قومی نغموں کو واقعات اور حالات کے ساتھ ہم آہنگ کر کے اُن کو بامقصد بنا دیا۔ اِس کے بعد محنت کشوں کے گیت اور وطن کی تعمیر پر ''یہ فیصلہ ہے وطن کو سجا کے دم لیں گے'' اور ''وطن کو ہم عظیم سے عظیم تر بنائیں گے'' جیسے نغمات نے اُن نغموں کی افادیت کو بڑھا دیا۔ سیلاب یا دوسری آفات پر اُن گنت ایسے گیت اور نغمے پیش ہوئے جنھوں نے لوگوں کی ہمت بندھائی اور دُکھ میں سہارا دیا۔ پھر لاہور کی اسلامی سربراہی کانفرنس کے لیے ''اتحادِ ملتِ اسلامیہ پائندہ باد'' جیسا نغمہ وقت سے ہم آہنگ اور دلوں کو چھو لینے والا نغمہ ثابت ہوا۔

آج جب بھی پاکستان کی غزل سنائی دیتی ہے یا مقصدی گیت سنائی دیتے ہیں تو ہر گیت کے ساتھ گیلانی صاحب کی روح کا ٹچ واضح محسوس ہوتا ہے۔ ہر ایسی غزل میں اور ہر ایسے گیت میں گیلانی صاحب شامل ہوتے ہیں۔ اللہ اُن کو وہاں بھی احسن طریقے سے رکھے، آمین!

کرسمس، بڑا دن، جشنِ ولادتِ مسیح، عیدِ ولادتِ مسیح میسیحیت میں ایسٹر کے بعد سب سے اہم تہوار سمجھا جاتا ہے۔ اِس تہوار کے موقع پر یسوع مسیح کی ولادت کی سالگرہ منائی جاتی ہے۔ گریگوری تقویم کے مطابق 24 دسمبر کی رات سے کرسمس کی ابتدا ہوتی ہے اور 25 دسمبر کی شام کو ختم ہوتی ہے جبکہ جولیئن تقویم کے پیروکار اہلِ کلیسیا کے ہاں 6 جنوری کی رات سے شروع ہو کر 7 جنوری کی شام کو ختم ہوتی ہے۔ گو کہ بائبل ولادتِ مسیح کی تاریخ کے ذکر سے یکسر خاموش ہے تاہم آبائے کلیسیا نے 325ء میں منعقدہ نیقیہ کونسل میں اِس تاریخ کو ولادتِ مسیح کا دن قرار دیا۔ عموماً یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ولادت کا وقت نصف شب کو رہا ہوگا پھر پوپ پائیس یازدہم نے کاتھولک کلیسیا میں سنہ 1921ء میں نصف شب کی ولادت کو باقاعدہ تسلیم کر لیا۔ کہا جاتا ہے کہ مسیحیت سے قبل بھی روم میں 25 دسمبر کو آفتاب پرستوں کا تہوار ہوا کرتا تھا چنانچہ ولادتِ مسیح کی حقیقی تاریخ کا علم نہ ہونے کی بنا پر آبائے کلیسیا نے یسوع مسیح کو "عہدِ جدید کا سورج "اور "دنیا کا نور "خیال کرتے ہوئے اِس تہوار کو یومِ ولادت تسلیم کر لیا۔ کرسمس کو "عشرہ کرسمس " کا ایک حصہ خیال کیا جاتا ہے۔ عشرہ کرسمس اُس عرصے کو کہتے ہیں جس میں اُس یادگار سے جڑے دیگر واقعات مثلاً بشارتِ ولادت، ولادتِ یوحنا اصطباغی اور ختنہ مسیح وغیرہ پیش آئے۔ چنانچہ اِس پورے عرصے میں گرجا گھروں میں اُن تمام واقعات کا ذکر ہوتا ہے۔

کرسمس کے موقع پر مذہبی مجلسیں منعقد ہوتی ہیں۔ خصوصی عبادتیں انجام دی جاتی ہیں نیز خاندانی اور سماجی تقریبات کا اہتمام ہوتا ہے جن میں شجرہ کرسمس کی رسم، تحائف کا لین دین، سانتا کلاز کی آمد اور عشائے کرسمس قابلِ ذکر ہیں۔ غیر مسیحی معاشروں میں بھی اِس تہوار کو خصوصی طور پر منایا جاتا ہے نیز کرسمس کا یہ دن اُن چند دنوں میں شمار کیا جاتا ہے جن میں سب سے زیادہ خریداری ہوتی ہے اور بڑے پیمانے پر سرمایہ صرف کیا جاتا ہے اسی طرح کرسمس کے مخصوص نغمے، موسیقی، فلمیں اور ڈرامے بھی بنائے گئے ہیں جو اِس موقع پر بڑے اہتمام سے سنے اور دیکھے جاتے ہیں۔

مسیحی تہواروں میں اسے خاص مقام حاصل ہے۔ 25 دسمبر کی تاریخ غالباً اس لیے چُنی گئی کہ یسوع کے ظہور کی تاریخ سے قریب ہے اور مشرق میں عام طور پر اِس دن یسوع کا یومِ پیدائش بھی منایا جاتا تھا۔ اِس کے علاوہ اِس زمانہ میں مشرق میں ہمیشہ بڑے جشن ہوا کرتے تھے۔ یورپ میں کرسمس کا تہوار بڑے پیمانے پر عہدِ وسطیٰ سے منایا جانے لگا۔ انگلستان میں انگلیکان کلیسیا اور پروٹسٹنٹ کلیسیا میں اِس مسئلہ پر سخت جھگڑے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ چنانچہ انیسویں صدی عیسوی تک بڑے پیمانے پر یہ تہوار منانے پر اسکاٹ لینڈ میں پابندی لگی رہی۔ آج کل جو کرسمس کے موقع پر ٹرکی یا بطین قربان کی جاتی ہیں، تحائف دیے جاتے ہیں، خاص قسم کے گیت گائے جاتے ہیں، یہ خالص انگریز رسوم ہیں۔ یہیں سے اُن کی ابتدا ہوئی ہے۔ کرسمس کے موقع پر درختوں کو سجانے، اُن پر روشنی کرنے اور تحفے لٹکانے کی رسم عہدِ وسطیٰ میں جرمنی میں شروع ہوئی۔ کرسمس کے کارڈ بھیجنے اور سانتا کلاز کو مقبولیت امریکا میں حاصل ہوئی۔ کاتھولک کلیسیاؤں اور بعض پروٹسٹنٹ کلیسیاؤں میں اِس تاریخ کو آدھی رات کے وقت عبادت ہوتی ہے۔

جشنِ ولادت کے اِس موقع پر تمام گرجا گھروں میں قدّاس الٰہی کا اہتمام کیا جاتا ہے نیز مشرقی راسخ الاعتقاد گرجا گھروں میں روزے بھی رکھے جاتے ہیں۔ اِن کے ساتھ ساتھ دیگر بہت سی رسمیں اور سماجی تقریبات منعقد ہوتی ہیں۔

کرسمس کے موقع پر گھروں، گرجا گھروں، سڑکوں، میدانوں اور دیگر مقامات کو خوب سجایا جاتا ہے۔ عموماً سبز اور سرخ رنگوں کو اِس موقع پر استعمال کیا جاتا ہے اور سونے چاندی کے رنگ کی چیزیں کھائی جاتی ہیں۔ سبز رنگ کو "ابدی زندگی " کا استعارہ سمجھا جاتا ہے اور ایسے سرسبز درخت بنائے جاتے ہیں جن کے پتے کبھی نہیں جھڑتے جبکہ سرخ خود یسوع مسیح کا رنگ ہے۔ اِس موقع پر آرائش و زیبائش کی تاریخ خاصی پرانی ہے۔ پندرہویں صدی عیسوی میں خصوصاً لندن میں اِس کا چلن ہوا۔ اُس وقت مختلف طریقوں سے گھروں اور گرجا گھروں کو سجایا جاتا تھا نیز کرسمس کی اُس سجاوٹ میں شجرہ کرسمس کو خاص مقام حاصل تھا کیونکہ ایک طرح سے اُس درخت کو یسوع کی زمین پر آمد کا استعارہ سمجھا جاتا۔ شجرہ کرسمس ''لبلاب'' کے درخت کا بنایا جاتا ہے جس کے سرخ پھول یسوع مسیح کے خون کی جبکہ اِس کے کانٹے اُس کانٹوں بھرے تاج کی یاد دلاتے ہیں جسے عہد نامہ جدید کے مطابق انھوں نے اپنے مقدمے کے دوران میں اور سولی پر چڑھتے وقت پہن رکھا تھا۔

ریڈیو پاکستان بھٹ شاہ کی 16ویں سالگرہ

تحریر: نثار احمد مگسی

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ سندھی زبان کے سب سے بڑے شاعر اور برصغیر کے صوفی بزرگ مانے جاتے ہیں۔ضلع ٹیاری میں واقع شہر بھٹ شاہ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے نام سے پوری دنیا میں اپنی پہچان رکھتا ہے۔حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے پیغام امن، بھائی چارہ، اخوت، مذہبی ہم آہنگی کے فروغ کیلئے اُس وقت کے وزیراعظم اسلامی جمہوریہ پاکستان جناب شوکت عزیز نے بھٹ شاہ کے دورے کے دوران شہر بھٹائیؒ کے عوام کو بطور تحفہ ایف ایم ریڈیو کا اعلان کیا جس کی بلڈنگ (براڈ کاسٹنگ ہاؤس) صوبائی حکومت محکمۂ سیاحت وثقافت سندھ نے مختص کیا اور فوری طور پر 13 دسمبر 2008 میں ریڈیو پاکستان بھٹ شاہ کی آواز ہوا کے دوش پر بھٹ شاہ اور قریب 60 تا 70 کلومیٹر چاروں اطراف گونجنے لگی اور لوگوں میں بہت خوشی کا سماں تھا۔اُس وقت کے اسٹیشن ڈائریکٹر جناب محمد علی بھانھن اور پروڈیوسر سید عابد عباس کاظمی نے نت نئے پروگرام شاہ کی شاعری سے ٹائٹل منتخب کئے جو کہ اب تک مقبولیت رکھتے ہیں۔ 16ویں سالگرہ کے موقع پر اسٹیشن ڈائریکٹر ریڈیو پاکستان بھٹ شاہ نثار احمد مگسی نے آئے ہوئے مہمانوں کو سندھ کا روایتی تحفہ سندھی ٹوپی اور اجرک پیش کیا اور سالگرہ کا کیک کاٹا۔تمام آئے ہوئے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور ریڈیو پاکستان بھٹ شاہ کی کارکردگی کے حوالے سے اپنے خطاب میں کہا کہ ریڈیو پاکستان بھٹ شاہ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے پیغام کو عام کرنے کے ساتھ ساتھ قومی و بین الاقوامی حالاتِ حاضرہ سے آگاہی کا مقامی سننے والوں کے لئے عالیشان ذریعہ ہے۔اِس کا اندازہ روزانہ کی نشریات میں بیشمار ٹیلیفون کالز، میسجز خطوط وغیرہ سے لگایا جاسکتا ہے۔ ریڈیو پاکستان بھٹ شاہ نے شروع سے آج تک اپنے معیاری پروگراموں سے تمام سامعین کو جوڑ رکھا ہے۔درگاہ کے عام زائر سے لیکر تمام اہم شخصیات کے انٹرویوز اور تاثرات عام سامعین تک پہچانے میں ہمہ وقت پیش پیش ہے۔

آجکل ویب اسٹریمنگ/انٹرنیٹ کے ذریعے پوری دنیا تک شاہ صاحب کا پیغام پہنچ رہا ہے اور ہزاروں کی تعداد میں فالورز اور سبسکرائبرز موجود ہیں۔

واضح رہے کہ حال ہی میں ریڈیو پاکستان بھٹ شاہ میں صوت القرآن چینل کا کام مکمل ہونے کے بعد اپنی ٹیسٹ ٹرانسمیشن نشر کررہا ہے جس کے باقاعدہ افتتاح کے بعد شیڈول

ٹرانسمیشن نشر کرے گا۔اِس حوالے سے لوگوں میں بہت خوشی دیکھی جارہی ہے۔

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کا عُرس مبارک ہر سال 14 سے 16 صفرالمظفر تک منایا جاتا ہے جس میں پاکستان کے علاوہ بیرون ممالک سے بھی عقیدت مند حاضری دیتے ہیں۔ اِس سال عرس مبارک کے موقع پر موجودہ چیئرمین سینٹ (سابقہ وزیراعظم) سید یوسف رضا گیلانی، جناب فیصل کریم کنڈی (گورنر کے پی کے)، جناب کامران ٹیسوری (گورنر سندھ)، وزیرِ اعلیٰ سندھ سید مراد علی شاہ وفاقی اور صوبائی نمائندوں نے حاضری دی۔

اِس کے علاوہ محکمۂ ثقافت سندھ اور محکمہ اوقاف حکومت سندھ کے زیرِ اہتمام تقریبات جن میں سگھڑ کچہری ثقافتی گاؤں، زرعی گاؤں، مال مویشی کی نمائش، گھڑ سواری، ملاکھڑا مقابلے، محفلِ موسیقی اور شاہ صاحب کے کلام کے متعلق عالمی دانشور اپنے مقالات اپنی تحقیق پیش کرتے ہیں۔عُرس مبارک کے آخری دن پر بہترین کارکردگی حاصل کرنے والوں کو لطیف ایوارڈز اور شیلڈز سے نوازا جاتا ہے۔عُرس مبارک کی سرگرمیوں کو ریڈیو پاکستان بھٹ شاہ بھرپور طریقے سے کوریج کردیتا ہے جس کی رپورٹس نیٹورک سے براہِ راست نشر ہوتی ہیں۔

نشریاتی سفر کی 16 سالہ تقریب میں ساجی، ادبی شخصیات، مقامی فنکاروں، شعراء کرام، لسنرز، آرٹسٹس اور ریڈیو پاکستان بھٹ شاہ کے عملے نے شرکت کی اور اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ سندھ کی سرزمین اولیاء کرام کی دھرتی تصور کی جاتی ہے اور اولیاء کرام نے امن، محبت اور بھائی چارہ کا درس دیا ہے۔

شاہ صاحبؒ نے اپنی شاعری کے ذریعے اللہ اور اُس کے حبیب حضور اکرم ﷺ کے پیغام کو عام لوگوں تک پہنچایا۔واقعہ کربلا، تاریخ، ثقافت اور رومانوی داستانوں سمیت انہوں نے زندگی کو بامقصد بنانے کے لئے ہر پہلو کو اُجاگر کیا ہوا ہے۔اِس نفسانفسی کے عالم میں لطیف کا پیغام دنیاوی مسائل کا حل ہے۔اِس کو جتنا عام کیا جائے وہ کم ہے کیونکہ شاہ عبداللطیفؒ نے اپنے پیغام پر عمل کرکے دنیا اِس عالمی مسائل سے نبرد آزما ہوسکتی ہے۔شاہ عبداللطیفؒ نے نہ صرف علاقائی امن بلکہ پورے عالم کیلئے انسان دوست فلسفہ پیش کیا ہے۔

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے آج سے تین صدیاں قبل اپنی شاعری میں عورت کو اعلیٰ مقام دیا ہے جس کا ثبوت اُن کی سات سورمیاں ہیں۔شاہ صاحب کی شاعری برصغیر کے شاعرانہ روایت سے بہت ہٹ کر ہے جہاں عورت کے لب و رخسار، قدو قامت اور زلف وآبرو کی بات نہیں بلکہ عورت کے کردار کو مثالی انداز میں بیان کیا ہے۔اُن کے ہاں عورت کا مقام عظیم ہے جس کا حُسن اِس کا کردار ہے۔انہوں نے کہیں بھی عورت کو محض عورت ہونے کی وجہ سے کردار نہیں بنایا بلکہ اُن کے نزدیک عورت میں فطری طور پر بہادری، لگن اور حوصلہ موجود ہوتا ہے اور اِس کے جذبے خالص ہوتے ہیں۔اُن کی شاعری میں عورت کے رتبے کو اعلیٰ مقام دیا گیا ہے۔

اِس ضمن میں ریڈیو پاکستان بھٹ شاہ کی خدمات کو کسی بھی طرح سے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔آخر میں تمام آہنگ قارئین کو ریڈیو پاکستان بھٹ شاہ کی 16ویں سالگرہ کے موقع پر دلی مبارکباد اور نیک تمنائیں، شکریہ

ریڈیو پاکستان لاہور کی 87 ویں سالگرہ

تحریر: جاوید پاشا

16 دسمبر 1937 کی ایک شام تھی جب مال روڈ پر واقع وائی ایم سی اے کے ایک کمرے میں آل انڈیا ریڈیو لاہور کا آغاز ہوا۔ آل انڈیا ریڈیو کے ترقیاتی منصوبے کا یہ پہلا میڈیم ویو سٹیشن تھا۔ اِس سے پیشتر برصغیر کے اس علاقے میں صرف شمال مغربی سرحدی صوبے کے شہر پشاور میں ریڈیو سٹیشن قائم تھا جس کا مقصد اِس صوبے کے علاوہ کابل کا احاطہ کرنا بھی تھا۔ پہلے سٹیشن ڈائریکٹر اے ایڈوانی مقرر ہوئے جو 12 جنوری 1938ء تک اسی عہدے پر فائز رہے۔ آواز یعنی اناؤنسمنٹ سے لاہور ریڈیو کے افتتاح کا اعزاز ملک حسیب احمد کو حاصل ہوا۔ پہلے دن کے پروگرام میں علامہ اقبالؒ کی ایک تقریر مولانا سالک نے پڑھ کر سنائی۔ اِس تقریر میں پنجاب کے ثقافتی پس منظر کے حوالے سے بات کی گئی تھی۔ پہلے دن کے پروگرام میں مبارک علی خان، فتح علی خان کی قوالی اور مولانا محمد بخش مسلم کی تقریر بھی شامل تھی۔ اِس کے علاوہ آل انڈیا ریڈیو دہلی سے خبریں نشر کی گئیں۔ شروع میں صرف شام کی مجلس ہوتی تھی۔ اُس وقت ریڈیو کا مقصد عوام کو تفریح مہیا کرنا تھا۔ اِسی بات کو سامنے رکھ کر پروگرام ترتیب دیے جاتے تھے۔ پروگراموں کی ترتیب میں 80 فیصد موسیقی اور 20 فیصد دوسرے پروگرام ہوتے تھے۔ جن پروگرام میں دیہاتی بچوں اور عورتوں کے پروگرام کے علاوہ تقریریں وغیرہ شامل تھیں۔ بعد میں دوپہر اور شام کی مجلسیں بھی ہونے لگیں۔ پھر صبح کی مجلس یعنی پہلی مجلس بھی ہونے لگی۔ اس کے علاوہ علامہ اقبال اور دیگر شعرا کے نغمے براڈ کاسٹ کئے جاتے۔ دوپہر کو فلمی گانے اور خبریں ہوتیں۔ خبریں آل انڈیا سے نشر کی جاتیں۔ ڈرامے کے فنکار اُس زمانے میں طفیل فاروقی، امیر خان، رفیع پیر، امتیاز علی تاج، اچلا سچدیو، پروفیسر ہنراج، اوما کشیپ شام سندرا، رملا کور تھے۔ اس کے علاوہ سلمٰی تصدق حسین بھی ڈراموں میں آیا کرتی تھیں۔ سید امتیاز علی تاج ڈرامے لکھتے بھی تھے اور ان میں حصہ بھی لیتے تھے۔ سید عابد علی عابد تاریخی ڈرامے لکھتے تھے۔ اس زمانے میں آج کے دور کی طرح جدید سہولتیں حاصل نہیں تھیں۔ مرزا ادیب، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر اور امرتا پریم کے ڈرامے بھی وقتاً فوقتاً نشر ہوتے رہتے۔ ڈرامہ ہفتے میں ایک بار رات کو ہوتا تھا۔ اِس زمانے میں میوزک کے پروگراموں کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔ کمپوز رکوئی نہیں ہوتا تھا، سب اپنی بنائی ہوئی دھنوں میں گاتے تھے۔ روزانہ دو کلاسیکل گانے والے اور دو ہلکا پھلکا گانے والے آرٹسٹ رکھے جاتے۔ شمشاد بیگم اور امراضیا بیگم گیت، غزل اور نعت پیش کرتیں۔ دیہاتی پروگرام میں اوم پرکاش، طفیل فاروقی اور شیخ اقبال ہوتے تھے۔ اوم پرکاش کے بعد مرزا سلطان بیگ دیہاتی پروگرام میں آئے۔ 1939 میں مونی داس (آپا شمیم) نے لاہور ریڈیو سٹیشن میں شمولیت کی تو بچوں کا پروگرام بھی انہوں نے کیا۔ خبریں دہلی سے نشر ہوتیں تھیں جو شکیل احمد اور انور بہزاد پڑھتے تھے۔ اُن دنوں مشاعروں میں حفیظ جالندھری، عابد علی عابد، ہری چند اختر، جگن ناتھ آزاد اور فیض احمد فیض حصہ لیتے تھے۔ پاکستان بننے سے چند سال پیشتر طالش، سنتوش کمار اور درپن بھی لاہور ریڈیو کے ڈراموں میں حصہ لیتے رہے۔ اُس زمانے میں لاہور ریڈیو سے عبدالقادر اور ظہور آزر بھی تقریریں کرنے لگے۔ آغا حشر کے ڈرامے بھی نشر ہونے لگے جن پر بہت محنت کی جاتی۔ بعد کے دنوں میں اخلاق احمد دہلوی، صوفی غلام مصطفیٰ، یوسف ظفر، اشفاق احمد، شاد امرتسری، ن م راشد، اعجاز حسین بٹالوی، رضی ترمذی، حفیظ ہوشیار پوری، مختار صدیقی، ممتاز مفتی، مرزا ادیب، اے حمید، مولانا صلاح الدین احمد، چراغ حسن حسرت، حفیظ جالندھری، عبدالمجید سالک، غلام رسول مہر، پروفیسر وقار عظیم، عبادت بریلوی نے اپنے علم وفن سے اس صحرا کو گل وگلزار بنایا۔ فیچر اور ڈراموں کے ذریعے اپنے فن کے موتی بکھیرے۔ موسیقی کے پروگراموں میں

جن موسیقاروں اور گلوکاروں نے ابتدا میں کام کیا اُن میں نیاز حسین شامی، بھائی لعل محمد، امیر علی خان، روشن آراء بیگم، نزاکت علی، سلامت علی، امانت علی، فتح علی، زاہدہ پروین، فریدہ خانم، منور سلطانہ، استاد برکت علی خان، بڑے غلام علی، مبارک علی خان، طبلہ نواز استاد شوکت حسین، عابد علی بیلا، پیانو کے ماسٹر، ماسٹر صادق، سائیں اختر حسین، محبوب قادری، شوکت علی، استاد جھنڈے خان، طفیل فاروقی، ماسٹر عنایت حسین، حسن لطیف، سلیم اقبال، اقبال بانو، ثریا ملتانی کر، کوثر پروین، طفیل نیازی (جنہوں نے اقبال کی مشہور نظم ''لب پر آتی ہے'' دعا کی طرز بنائی) شامل تھے۔ شاعروں میں ملک کا شائد ہی کوئی شاعر ہوگا جس نے ریڈیو سے اپنا کلام انفرادی طور پر مشاعروں میں اور غزل، نظم اور دیگر کلام پیش نہ کیا ہو۔ ریڈیو لاہور اہلِ لاہور کی اُردو درست کرنے کا ایک ذریعہ بھی تھا۔ ریڈیو پاکستان لاہور نے بالخصوص شعبہ زراعت، موسیقی، مذہبی پروگرام، ادبی سلسلے اور ڈراموں کے حوالے سے خاص شہرت حاصل کی ہے۔ یہ سنٹر باقاعدہ ایک علمی، ادبی، ثقافتی مرکز بھی ہے۔ اِس کے بعض پروگرام اِس کی شناخت ہیں جن میں تلقین شاہ، سوہنی دھرتی، فوجی بھائیوں کا پروگرام پاسبان، پنجابی دربار، اُردو پنجابی ادبی پروگرام تخلیق رچناور بچوں کا پروگرام ہونہار شامل ہیں۔ 1965ء کی 17 روزہ جنگ میں ریڈیو لاہور نے جذبۂ حُب الوطنی اُبھارنے میں جو خدمات پیش کیں وہ اِس نشریاتی ادارے کا ایک طرۂ امتیاز ہے۔ اِس کے علاوہ جنگ کے حالات اور اُن سے متعلق خبروں کا تیز ترین اور سب سے موثر ذریعہ بھی ریڈیو لاہور ہی تھا جس پر پورا ملک انحصار کر رہا تھا۔ آزمائش کے اُن سترہ دنوں میں ریڈیو کے فنکار، موسیقار اور گلوکار بھی کسی سے پیچھے نہ رہے جنہوں نے سترہ دنوں میں 72 ترانے لکھے، کمپوز کیے، گائے اور نشر کیے جو ایک ریکارڈ ہے۔ الغرض ریڈیو لاہور پاکستان کی آواز ہے جو پاکستان کے عوام کے ساتھ ہم آواز ہے۔ ریڈیو پاکستان لاہور سے اُس وقت ایف ایم 101، ایف ایم 93، ایف ایم 94 اور میڈیم ویو چینل سے سامعین کے ذوق وشوق کو مدِنظر رکھتے ہوئے مختلف علمی، ادبی، دینی، ثقافتی، کھیل اور صحت پر مبنی خصوصی پروگرام نشر کیے جاتے ہیں جنھیں سامعین میں بے حد پسندیدگی حاصل ہے۔ پاکستان لاہور کے موجودہ اسٹیشن ڈائریکٹر ڈاکٹر احمر سہیل بسرا ہیں جو ڈائریکٹر جنرل پی بی سی جناب سعید احمد شیخ کے وژن اور ڈائریکٹر پروگرام محترمہ راحیلہ تسنیم کی ہدایات کی روشنی میں اپنی ٹیم کے ساتھ ریڈیو پاکستان کے پروگراموں جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لئے بھرپور لگن سے دن رات کام کر رہے ہیں۔

موسیقار جی اے چشتی

کم وقت میں معیاری دُھنیں تخلیق کرنے کے ماہر

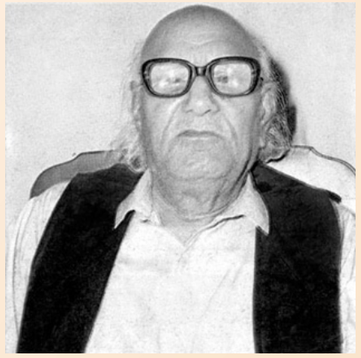

تحریر: ڈاکٹر امجد پرویز

جی اے چشتی کو کم وقت میں معیاری دُھنیں تخلیق کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔ اُردو فلموں کے علاوہ انہوں نے پنجابی فلموں میں بھی اپنی موسیقی کے جوہر دکھائے۔ پاکستان میں اُن کی فلموں کے نام تھے ''سچائی''، ''مندری'' اور ''پھیرے''۔ فلم ''پھیرے'' کی موسیقی نے دُھوم مچادی۔ یہ سلور جوبلی فلم تھی اور ہدایت کار وا یکٹر نذیر کی اپنی اہلیہ سورن لتا کے ساتھ مشترکہ کاوش تھی۔ یہ فلم ''گاؤں کی گوری'' کی ری میک تھی۔ اِس فلم کے گانے بابا عالم سیاہ پوش نے لکھے تھے۔ جی اے چشتی خود بھی گیت لکھتے تھے اور اُن کا لکھا اور کمپوز کیا گیت ''کہیہ کیتا تقدیرے، کیوں رول سُٹے دو ہیرے'' منور سلطانہ کی آواز میں مقبولیت کی تمام منزلیں چُھو گیا۔

جی اے چشتی موسیقار ہونے کے علاوہ معیاری دُھنیں تخلیق کرنے والے شاعر بھی تھے۔ اُنہوں نے پاکستانی فلموں کے لیے تقریباً ایک درجن گیت لکھے۔ جی اے چشتی نے ماسٹر عبداللہ کا شاہکار گیت جو کہ میڈم نور جہاں نے فلم 'جٹ مرزا' کے لیے گایا تھا، لکھا۔ انجمن پر فلمائے گئے اِس گیت کے بول تھے ''جنّاراہ تیرا تک تک ہاریاں، دل دے مَیں بوہے کھولے نیناں دیاں باریاں''۔ یہ فنی اعتبار سے بہت عمدہ گیت تھا

موسیقار جی اے چشتی اپنے کام کے اعتبار سے اپنے تمام ہم عصر ساتھیوں سے بازی لے گئے۔ پنجابی دائرہ بھصر کے علاوہ مغربی عصر کی ہلکی سی جھلک بھی بابا چشتی کے گیتوں میں نظر آتی ہے مثلاً عنایت حسین بھٹی کا 1956ء کی فلم ''مورنی'' کا گیت ''ساڈی نظراں تو ہوئیوں کا ہنوں دُور دس جا''، 1960ء میں بننے والی فلم ''سلطنت'' میں عنایت حسین بھٹی اور آئرین پروین کا دوگانا ''قدم بڑھاؤ ساتھیو''، 1966ء میں ریلیز کی گئی فلم ''ابا جی'' کے لیے میڈم نور جہاں کا گایا ہوا گیت ''تینوں تکدی نہ رجاں''۔ موسیقار جی اے چشتی کے کئی ایسے مقبول نغمے، اُن کی دُھنیں اور شاعری اِس امر کی غمازی کرتے ہیں کہ اُن کے نغمے عوام کے دلوں کو چھوتے ہیں۔

رشید عطرے

بر صغیر کے منجھے ہوئے موسیقار

رشید عطرے کا شمار برصغیر کے بہت منجھے ہوئے اور سُریلے موسیقاروں میں ہوتا ہے۔ آپ کی پیدائش ایک مقبول گلوکار خوشی محمد کے ہاں 1919ء میں امرتسر میں ہوئی۔ رشید عطرے نے طبلہ نوازی کی تعلیم خان صاحب اشفاق حسین سے حاصل کی لیکن اُن کی توجہ جلد ہی موسیقی کمپوز کرنے کی طرف مبذول ہوگئی۔

رشید عطرے ماڈرن طرز کے گیتوں کو کمپوز کرنے میں مہارت رکھتے تھے۔ موسیقار رشید عطرے زمانہ شناس تھے۔ جہاں وہ ہر وقت سوٹ اور ٹائی میں ملبوس رہتے تھے وہاں وہ موسیقی کے شائقین کی نبض اور دِلوں کی دھڑکن سے واقف تھے۔ اُس دور کی میلوڈی میں جو مدوجزر آتا تھا، اُس کے مطابق دُھنیں کمپوز کرتے تھے لیکن اُن کی ذاتی ترجیح کلاسیکی موسیقی کو لائٹ میوزک اور کمرشل میوزک میں ڈھالنا تھا۔

موسیقار رشید عطرے کی فلم ''موسیقار'' کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ میڈم نور جہاں کو شائقین اُن کے گیت ''گائے گی دنیا گیت میرے'' سے مسنون کرتے ہیں۔ میڈم نور جہاں خود کہا کرتی تھیں کہ اُن کی رحلت کے بعد دنیا اُن کے گیت گائے گی اور یہ بات درست ثابت ہوئی۔ یہ کہنا بھی درست ہوگا کہ ''موسیقار'' فلم کے دیگر گانوں کا جیسے کہ ''یاد کروں تجھے شام سویرے'' اور ''تم جُگ جُگ جیو مہاراج رے'' کا بھی نور جہاں کی گائیکی کو اَمر کرنے میں بڑا عمل دخل ہے۔

ایک ایسا دَور بھی آیا کہ ہدایت کار حسن طارق نے فلم سٹار رانی کو نئی زندگی دینے کے لیے موسیقار رشید عطرے کا فلم ''محبوب'' کی موسیقی ترتیب دینے کا سہارا لیا اور میڈم نور جہاں کا گانا ''نگاہیں ملا کر بدل جانے والے'' اِس مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ٹھہرا۔

رشید عطرے نے فلم ''گہرا داغ'' کے لیے ''گرتم حسین نہ ہوتے'' جیسا خوبصورت گیت کمپوز کیا۔ سلیم رضا کی غزل ''حسن کو چاند جوانی کو کنول کہتے ہیں'' رشید عطرے کی موسیقی کی لڑی میں ایک نمائندہ موتی ہے۔

رشید عطرے آج ہم میں نہیں ہیں لیکن اُن کی موسیقیت میں ڈھلے سدا بہار گیت آج بھی سننے والوں کے کانوں میں رَس گھولتے ہیں۔

چھوٹے غلام علی خان

اُستاد چھوٹے غلام علی خان 1910ء کو ضلع قصور میں پیدا ہوئے۔ اُن کا تعلق قصور کے ایک موسیقی کے گھرانے سے تھا۔ انہوں نے موسیقی کی ابتدائی تربیت اپنے والد میاں امام بخش سے حاصل کی جو دھرپد انداز گائیکی میں کمال رکھتے تھے۔ اُستاد چھوٹے غلام علی خان خیال، ترانہ، ٹھمری، دادرا اور غزل سبھی یکساں مہارت سے گاتے تھے۔ وہ ایک عرصہ تک الحمراہ آرٹس کونسل لاہور سے وابستہ رہے جہاں اُنہوں نے موسیقی کی تربیت کے لیے ایک اکیڈمی قائم کی تھی۔ اُن کے شاگردوں میں پروین، بدرالزمان اور قمرالزمان کے نام نمایاں ہیں۔ حکومتِ پاکستان نے اُستاد چھوٹے غلام علی خان کی فنی خدمات کے اعتراف کے طور پر 14 اگست 1985ء کو صدارتی تمغہ برائے حُسنِ کارکردگی عطا کیا۔

چھوٹے غلام علی خان نے پانچ سال کی چھوٹی سی عمر میں گانا شروع کر دیا تھا۔ اُنہوں نے بڑے بڑھے خان صاحب کی باقاعدہ شاگردی اختیار کی۔ اُن کا 35 اور 40 سال کی عمر کا درمیانی حصہ ریاض کرتے ہوئے ہی گزرا۔ ایک سوال کے جواب میں چھوٹے غلام علی خان نے ریاض کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ ''ریاضت کے بغیر گانا بجانا ممکن نہیں اور مَیں تقریباً صبح اُٹھ کر دو تین گھنٹے ضرور ریاضت کو دیتا ہوں۔'' چھوٹے غلام علی خان کے اُستادوں میں حاجی امیر بخش، بڑے بڑھے خان، میاں مولا بخش اور حسین بخش خان ہیں جن سے اُنہوں نے موسیقی کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔

چھوٹے غلام علی خان جب 35 سے 40 سال کی عمر کے تھے تو تب ہی لوگ اُن کی شاگردی میں آنا شروع ہو گئے تھے۔ وہ اپنے شاگردوں میں محمد رفیع جو فلمی گانے گایا کرتے تھے، ملتان کی فیرودی مرحوم، حاجی سلامت علی اور اُن کے علاوہ قمرالزمان اور بدر الزمان کا ذکر اکثر کیا کرتے تھے۔ انہیں اپنے شاگردوں سے بہت محبت تھی اور اُن کے شاگرد بھی چھوٹے غلام علی خان کے ساتھ پیار محبت اور احترام رکھتے تھے۔

ملکۂ موسیقی روشن آراء بیگم

ملکۂ موسیقی روشن آراء بیگم 19 جنوری 1913ء کو کلکتہ میں اُستاد عبدالحق خان کے گھر پیدا ہوئیں۔ اُن کا اصل نام وحید النساء بیگم تھا۔ انہوں نے موسیقی کی تعلیم اپنے قریبی عزیز اُستاد عبدالکریم خان سے حاصل کی جن کی وساطت سے اُن کا تعلق موسیقی کے کیرانہ گھرانے سے بنتا ہے۔ اُستاد عبدالکریم خان صاحب سے سیکھے ہوئے راگوں میں چار کو چُن کر ان کو ریکارڈ پر گایا۔ "بسنت، شدھ کلیان، شنکر، اچھنبوی"۔ اِس میں شک نہیں کہ روشن آراء بیگم کا مزاج خان صاحب کے مزاج سے بہت مختلف تھا۔ عبدالکریم خان خاموش طبع اور سنجیدہ بزرگ تھے جبکہ روشن آراء بیگم کا سبھاؤ چنچل اور شوخ تھا۔

روشن آراء بیگم تقسیم ہند سے پہلے ہی کیرانا گھرانے کے خیال گائیکی میں ایک بلند مقام حاصل کر چکی تھیں کیونکہ 1930ء کے عشرے کے آواخر میں وہ کلکتہ سے بمبئی منتقل ہوگئی تھیں۔ تقسیم ہند سے پہلے بھی وہ خاص طور پر آل انڈیا ریڈیو کے پروگراموں میں حصہ لینے کے لیے لاہور کا سفر کیا کرتی تھیں جہاں وہ موسیقی کی دیگر محافل میں بھی اپنے فن کا مظاہرہ کر کے خوب داد سمیٹتی تھیں۔ لاہور میں موچی گیٹ کے قریب محلّہ پیر گیلانیاں میں جن پیڑ کے ڈیرے پر اُن کے ساتھ یادگار محفلیں سجاتی تھیں۔

ملکۂ موسیقی روشن آراء بیگم نے فلموں کے لیے بھی کچھ گیت گائے جن میں زیادہ تر کی دُھنیں انیل بسواس، فیروز نظامی، نوشاد اور تصدق حسین جیسی اپنے دور کے نامور موسیقاروں نے ترتیب دی تھیں۔ انہوں نے جن فلموں کے لیے گیت گائے اُن میں 1978ء میں پاکستان منتقل ہونے کے بعد اُن کی شادی کلاسیکی موسیقی کے دلدادہ ایک پولیس افسر احمد خان کے ساتھ ہوئی جن کا تعلق لالہ موسیٰ ضلع گجرات سے تھا اور روشن آراء بیگم اسی چھوٹے سے شہر سے ریڈیو پاکستان اور پی ٹی وی کے پروگراموں میں شرکت کیلئے لاہور کا سفر کیا کرتی تھیں۔

ملکۂ ترنم نور جہاں

آہنگ ڈیسک

ملکۂ ترنم نور جہاں ایک موسیقار گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ اُن کا گھرانہ چونکہ گانے بجانے سے وابستہ تھا اِسی لیے اُن کے گھر والوں نے انہیں بھی موسیقی کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے اُستاد کے پاس بٹھا دیا۔ جبکہ نور جہاں ذاتی طور پر اداکاری کرنے کو بھی پسند کرتی تھیں اور کئی فلموں میں اپنی اداکاری کے جوہر بھی دکھا چکی ہیں۔ ملکۂ ترنم نور جہاں نے اُستاد بابا غلام محمد سے موسیقی کی تربیت حاصل کی۔ انہیں کلاسیکی روایتی ہندوستانی موسیقی کی خصوصی تربیت دی گئی تھی۔ اُن کو ڈھومری، دھرپد، خیال اور دیگر اصنافِ موسیقی پر چھوٹی عمر میں ہی عبور حاصل ہو چکا تھا۔ ملکۂ ترنم نور جہاں نے کم سنی میں ہی اسٹیج پر اداکاری اور گلوکاری کا مظاہرہ کیا۔ بعدازاں اپنی بہنوں کے ساتھ کلکتہ چلی گئیں۔ نور جہاں کی بہنوں کو سیٹھ سکھ کرنانی کی کمپنی میں ملازمت مل گئی اور تینوں بہنیں ''پنجاب میل'' کے نام سے مشہور ہوئیں۔

اُنہوں نے کئی فلموں میں بچپنے کے کردار بھی کیے۔ 1935ء میں کے ڈی مہرہ کی فلم ''پنڈ دی کُڑی''، فلم ''مصر کا ستارہ'' اور 1946ء میں گائیکی و اداکاری بھی کی۔ 1937ء میں ''ہیر سیال'' میں نور جہان نے ہیر کے بچپن کا کردار بھی ادا کیا۔

کلکتہ میں کچھ عرصہ قیام کے بعد نور جہاں لاہور واپس آ گئیں۔ ماسٹر غلام حیدر نے اُن کے لیے بہت سی دُھنیں ترتیب دیں جنہیں گا کر نور جہاں کی شہرت میں مزید اضافہ ہوا۔ نور جہاں نے پہلی بار سیٹھ دل سکھ جو پنچولی اسٹوڈیو کے مالک تھے، کی فلم گُل بکاولی کے لیے گیت گایا جس کے بول تھے ''شالا جوانیاں مانے، آکھا نہ موڑیں''۔ نور جہاں نے 1942ء میں پران کے مدِ مقابل فلم ''خاندان'' میں مرکزی کردار ادا کیا۔ بطور مرکزی اداکارہ یہ فلم نور جہاں کی اولین فلم تھی جو کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ بعدازاں نور جہاں نے 1943ء میں بننے والی فلم ''دہائی'' کے لیے گیت گائے۔ یہ دوسری بار تھا کہ ملکۂ ترنم نور جہاں نے اپنی آواز کسی دیگر اداکارہ کے لیے دی۔ سعادت حسن منٹو رفیق غزنوی اور نور جہاں کی بابت لکھتے ہیں کہ ''رفیق غزنوی ایک رومان پرور انسان تھے۔ رفیق غزنوی ملکۂ ترنم نور جہاں سے بے حد متاثر تھے۔ رفیق غزنوی نے سعادت حسن منٹو سے نور جہاں کا تعارف کرواتے ہوئے کہا تھا کہ

''منٹو یہ نور ہے، نور جہاں ہے، سرورِ جہاں ہے۔ خدا کی قسم ایسی آواز پائی ہے کہ جنت سے خوش الحان بھی اس کی آواز سُن لے تو اِسے سندور کھلانے زمین پر اُتر آئے''۔

1947ء میں ملکۂ ترنم نور جہاں ہجرت کر کے بمبئی سے پاکستان آ گئیں۔ 29 مارچ 1951ء کو پنجابی فلم ''چن وے'' ریلیز ہوئی جو نور جہاں کی پاکستان میں بطور ہیروئن پہلی فلم تھی اور اُس کی ڈائریکٹر بھی وہ خود ہی تھیں اور موسیقی فیروز نظامی کی تھی۔ اِس فلم میں نور جہاں کے علاوہ سنتوش، جہانگیر خان، یاسمین اور غلام محمد شامل تھے۔ لاہور میں یہ فلم ریجنٹ سینما پر 18 ہفتے تک سپر ہٹ بزنس کرتی رہی۔ کراچی میں یہ فلم 13 اپریل 1951ء کو ریلیز ہوئی اور نو ہفتے تک جوبلی سینما پر بزنس کرتی رہی۔ 29 مارچ 1992ء کو ''دوپٹہ'' ریلیز ہوئی جس کے ڈائریکٹر سبطین فضلی تھے اور موسیقی فیروز نظامی کی تھی۔ اِس فلم کا معاوضہ ملکۂ ترنم نور جہاں نے اُس وقت 6 ہزار روپے لیا تھا۔ ملکۂ ترنم نور جہاں نے بطور گلوکارہ اور ہیروئن اپنا ایک خاص مقام پیدا کیا جن کے گائے گیت آج بھی مقبولیت کی اُسی بلندی پر ہیں جسے وہ چھوڑ کر 30 دسمبر 2000ء کو 80 سال دو ماہ کی عمر میں کراچی میں انتقال کر گئیں۔

گائے گی دنیا گیت میرے
سُریلے رنگ میرے، نرالے رنگ میرے
بھرے ہیں ارمانوں میں

موسم سرما میں جلد کی حفاظت

سردیوں میں جلد کا خیال کیسے رکھیں؟

سردیوں کا موسم ویسے تو تقریباً سب کے لئے پسندیدہ ہوتا ہے۔ ڈرائی فروٹ، رنگ برنگی سبزیاں اور رس دار پھل اِس موسم کا وہ تحفہ ہوتے ہیں جن سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا مگر اِس موسم کے استقبال میں ہماری جلد ہمارا ساتھ نہیں دیتی۔ خشکی کے سبب رنگت اور چہرہ بے رونق دکھائی دیتا ہے۔ چہرے کی تازگی کیلئے مہنگی کریموں کے استعمال کی بجائے اپنے باورچی خانے سے بھی مستفید ہو سکتے ہیں۔ مثلاً

گلیسرین لیموں اور عرق گلاب:

گلیسرین، لیموں کا رس اور عرق گلاب تینوں ہم وزن لے کر مکسچر بنا لیں۔ اِس مکسچر کو ہاتھوں اور پاؤں پر لگائیں۔ اِس سے خشکی دور ہونے کے ساتھ ساتھ جھریاں اور داغ دھبے بھی دور ہونگے۔

دودھ اور بادام کا ماسک:

ایک چمچ بادام پیس کر اِس میں دو چمچ دودھ ملا کر پیسٹ بنا لیں۔ اِس کو چہرے پر لگا لیں۔ خشک ہونے پر ٹھنڈے پانی سے منہ دھو لیں۔ دودھ اور بادام میں موجود وٹامن ای (Vitamin E) جلد کی رنگت نکھارتا ہے اور اُسے تر و تازہ بناتا ہے۔

لیموں اور شہد کا ماسک:

دو چمچ شہد میں آدھا لیموں نچوڑ لیں۔ اسکو اچھی طرح ملا کر پیسٹ بنا لیں اور چہرے پر لگائیں۔ خشک ہونے کے بعد دھو لیں۔ اِس سے نہ صرف رنگت سفید ہوتی ہے بلکہ جلد کے دھبے بھی صاف ہو جاتے ہیں۔

مکھن کے دودھ اور دہی کا ماسک:

مکھن کا دودھ وہ ہوتا ہے جو چھاچھ بنانے کے بعد مکھن نکالنے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔

اسکو ہم وزن وہی کے ساتھ ملا کر دس سے پندرہ منٹ تک جلد پر لگائیں رکھیں اور پھر دھو لیں۔ اِس سے چہرہ موسچرائز ہو گا۔ جلد بارونق نظر آئے گی۔

پیٹرولیم جیلی کا استعمال:

نہانے سے پہلے پیٹرولیم جیلی کو پورے جسم اور چہرے پر ہلکے ہاتھوں سے مساج کر لیں۔ پندرہ منٹ بعد نیم گرم پانی سے نہا لیں۔ اِس سے خشکی کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور چہرہ شاداب نظر آتا ہے۔

دور بہت دور آسمان کو چھوتے پہاڑوں پر چند اللہ والے ساری دنیا سے الگ تھلگ صرف یادِ الٰہی میں مصروف رہتے تھے۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ بہت سخت قسم کی سردیاں آ گئیں۔ اوپر سے برف باری بھی شروع ہوگئی۔ یہ اللہ والے جس غار میں رہتے تھے اُس میں کھانے پینے کی ساری چیزیں ختم ہوگئیں۔ پانی کا البتہ کوئی مسئلہ نہیں تھا کیونکہ غار کے دہانے سے تھوڑے ہی فاصلے پر ٹھنڈے میٹھے پانی کا چشمہ بھی اُبلتا تھا۔ پھر برف باری کی وجہ سے غار کے سامنے بھی اتنی ساری اور شفاف برف جمع ہوگئی تھی کہ اُن کو چشمے تک جانے کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی جو ویسے ہی برف باری کی وجہ سے جم چکا تھا۔ اُنہوں نے آگ کے لیے لکڑیاں تو بہت ساری جمع کر رکھی تھیں مگر کھانے کا انتظام ضروری تھا۔

پہاڑ کے جنگل میں درخت اور پھل تو بہت تھے مگر بیچ میں دریا بھی تھا اور کھائی بھی۔ اِس سردی اور برف باری میں دونوں کو پار کرنا بھی مشکل تھا۔ آخر اللہ والوں نے فیصلہ کیا کہ ہم سب مل کر نیچے واقع گاؤں میں چلیں گے جو یہاں سے بہت زیادہ دور بھی نہیں تھا اور راستہ بھی آسان تھا۔ بس بَل کھاتے پہاڑی راستوں سے گزرنا تھا۔ خیر اگلی صبح یہ پانچوں درویش صاحبان اکٹھے نیچے اترے۔ گاؤں پہنچتے تک دوپہر بھی ہوگئی۔ اُن میں جو سب سے بوڑھا درویش تھا' اُس نے گاؤں کے سردار سے ملاقات کی اور اپنا مسئلہ بیان کیا۔ گاؤں والے اُن پانچوں درویشوں سے نہ صرف اچھی طرح واقف تھے بلکہ دراصل اُن کو وہی کھانے پینے کی چیزیں بھی پہنچا دیا کرتے تھے۔ اِس پر اُن درویشوں کا گزارا تھا۔ گاؤں کے سردار نے سب کو بہت احترام سے اپنے گھر میں بٹھایا اور پورے گاؤں میں اعلان کروا دیا کہ جو بھی گھرانا اُن درویشوں کے لیے جو کچھ دے سکتا ہے دے دے۔ گاؤں والے خود انتہائی غریب تھے۔ اوپر سے موسم کی وجہ سے نہ کھیتوں میں جا سکتے تھے نہ جنگل میں۔ خود اُن کے پاس کھانے کی چیزوں کی کمی تھی۔ بہرحال گاؤں کے سردار کے حکم پر دو آدمی گھر گھر گئے اور ایک بڑی ٹوکری میں جس گھر سے جو ملا جمع کرتے گئے۔ پھل، سبزیاں، انڈے، دودھ، گوشت، اناج اور چند جوڑے گرم کپڑوں کے بھی۔ الغرض رنگ برنگ کی چیزیں جمع ہوگئیں جو اُن درویشوں کے لیے کئی ہفتوں کے لیے کافی تھیں۔ ٹوکری اوپر تک ٹھساٹھس بھر گئی۔

یہ گاؤں والوں کی نیک نیت کا صلہ تھا۔ گاؤں کے سردار نے یہ ٹوکری بلکہ ٹوکرا، درویشوں کے سردار کو پیش کر دیا اور اپنی طرف سے ہر ایک کے لیے ایک بڑا اور عمدہ کمبل بھی جو اتنا بڑا تھا کہ ہر درویش آدھا کمبل بچھا کر باقی آدھا کمبل اوڑھ بھی سکتا تھا۔ ایک اور نیک آدمی نے اپنے گھر کے سارے تکیے لا دیئے تاکہ درویش سردی میں بغیر تکیے کے نہ سوئیں۔ درویشوں نے منع بھی کیا مگر اُس نے کہا ''آپ سب کی دعا سے ہمارا اپنا گھر، اپنی چھت اور اپنے بستر ہیں۔ صرف تکیوں کے لیے کوئی دوسرا کپڑوں کا پوٹلا گھر کی عورتیں بنالیں گی۔ یہ ہم سب کی طرف سے آپ اللہ والوں کے لیے نذرانہ ہے قبول فرمالیں۔''

سارے درویشوں نے ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر اُن گاؤں والوں اور اُن کے سردار کے لیے دعائیں کیں جس کا آسمان کی طرف سے جواب یہ ملا کہ سردار کی نسلیں آج تک اُس گاؤں کی سرداری کر رہی ہیں جو اَب پورا شہر بن چکا ہے اور غربت اور تنگ دستی اِس بستی کی طرف رُخ کرنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتی!

سبق! نیکی کبھی رائیگاں نہیں جاتی اور اپنا صلہ آپ دیتی ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔

آہنگ کا دسترخوان

چکن چاؤمن سوپ

اجزاء:

یخنی : چار کپ

باریک کٹی ہری پیاز: ایک عدد

مشروم : چار عدد

پانی: دو کپ

بین سپراؤٹس: 1/2 کپ

بند گوبھی: 1/2 کپ

گاجر: 1/2 کپ

نوڈلز: 100 گرام

چکن کیوبز: 200 گرام

سرکہ : ایک کھانے کا چمچہ

کالی مرچ : 1/2 چائے کا چمچہ

نمک : 1/2 چائے کا چمچہ

سویا ساس : دو کھانے کے چمچے

ترکیب:

پہلے 200 گرام چکن کیوبز کو پانی میں ڈال کر اُبلنے کے لیے رکھ دیں۔ جب اُبال آجائے تو اُس میں چار کپ یخنی شامل کر دیں۔ اب اِس میں 100 گرام نوڈلز ڈال دیں۔ جب نوڈلز گل جائیں تو اُس میں چار عدد مشروم، 1/2 کپ بین سپراؤٹس، 1/2 کپ بند گوبھی اور 1/2 کپ گاجر شامل کر کے دو سے تین منٹ پکنے دیں۔ اِس کے بعد 1/2 چائے کا چمچہ کالی مرچ، 1/2 چائے کا چمچہ نمک، دو کھانے کے چمچے سویا سوس اور ایک کھانے کا چمچہ سرکہ ڈال دیں۔ اب چولہا بند کر کے تیار سوپ ڈش میں نکالیں اور ایک عدد باریک کٹی ہری پیاز سے گارنش کر کے سرو کریں۔

فِش دَم پُخت

اجزاء:

ثابت مچھلی: ایک سے سوا کلو

چکن کا قیمہ: 100 گرام

مشروم ز : چار سے چھ عدد

نمک: حسبِ ذائقہ

لہسن کا پیسٹ: ایک کھانے کا چمچ

ادرک کا پیسٹ: ایک چائے کا چمچ

پیاز : ایک عدد درمیانی

مشروم ساس: ایک چائے کا چمچ

اویسٹر ساس: ایک چائے کا چمچ

کُٹی ہوئی لال مرچ: ایک چائے کا چمچ

کالی مرچ پسی ہوئی : آدھا چائے کا چمچ

لیموں: دو کھانے کے چمچ

کوکنگ آئل :حسبِ ضرورت

ترکیب:

مچھلی کو صاف دھو کر دس سے پندرہ منٹ کے لئے فریزر میں رکھیں۔ پھر اسے تیز چھری کی مدد سے دو طرف سے اِس طرح سے کاٹیں کہ درمیان کا کانٹا علیحدہ ہو جائے۔ نمک، لال مرچ، لہسن، دو کھانے کے چمچ کوکنگ آئل اور لیموں کے رس کو ملا کر مچھلی کے اوپر والے حصے پر اچھی طرح مل دیں اور اسے فریج میں رکھ دیں۔ ایک کھانے کے چمچ کوکنگ آئل میں باریک چوپ کی ہوئی پیاز کو ہلکی سی نرم ہونے تک فرائی کریں۔ پھر اُس میں ادرک، نمک، کالی مرچ، قیمہ اور چوپ کئے ہوئے مشروم ز ڈال کر تین سے چار منٹ فرائی کریں۔ آخر میں اُس میں اویسٹر ساس اور مشروم ساس ڈال کر چولہے سے اتار لیں۔ مچھلی کے ایک حصے پر چکن کے مکسچر کو ٹھنڈا کر کے رکھیں اور اسے دوسرے حصے سے بند کر دیں۔ گرل پین کو چولہے پر رکھ کر آٹھ سے دس منٹ گرم کر لیں پھر اُس پر ایک سے دو کھانے کے چمچ کوکنگ آئل ڈال کر مچھلی کو احتیاط سے دونوں طرف سے گرل کر لیں۔ اِس غذائیت سے بھرپور مزیدار مچھلی کو سلائسز کر کے سلاد کے ساتھ سرو کریں۔